



”تو ایسی کوئی کہانی نہیں تھی جب ہی تو کوئی شہزادہ شہشے کی گرگانی لیے اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے گھر تک پہنچ جاتا۔ وہ زارا اسدگی جس نے اب تک کا سارا سفر ننگے پاؤں ٹوٹے کانچ پر چلتے ہوئے کیا تھا۔ شاید کہانیوں کی دنیا سے چرائی شہشے کی گرگانی اس کے ہاتھ سے گر کر چھوٹ گئی تھی اور وہ اب تک ان ہی گرچیوں پر چلتی رہی تھی۔ بہت پہلے جب اس نے پڑھنا سیکھا تھا اور ایک ایک کر سنڈریلا کی کہانی پہلی بار پڑھی تھی تو اس نے سوچا تھا کہ ایک روز اسے بھی کوئی پری جادو کی بیسی پر بادشاہ کے محل میں لے جائے گی اور وہ اپنی شہشے کی گرگانی جلدی میں وہاں ہی چھوڑ آئے گی اور شہزادہ وہ گرگانی لے کر اسے ڈھونڈتا ہوا اس کے گھر تک آ جائے گا۔ حالانکہ اس کی کوئی سوتیلی بہنیں نہیں تھیں اور نہ ہی ماں سوتیلی تھی۔ ہاں باپ! اس کا باپ۔ گناہ تھا۔“

”کیا کوئی ایسی کہانی بھی ہے ماں جس میں باپ سگنا نہ ہو اور کوئی پری اس لڑکی کے لیے سفید ٹھونڈوں والی بیسی تیار کرے۔“

ایک روز اس نے ماں سے پوچھا تھا اور اس کی سیدی سادی ماں ہنس دی تھی۔

”کیسی عجیب باتیں کرتی ہو تم؟“

”بھلا اس میں عجیب کیا ہے ماں۔ یہ کہانیاں میں شہزادوں کی ماںیں ہی ہمیشہ سوتیلی ہوتی ہیں۔ سوتیلی باپ کیوں نہیں ہوتے۔“

”اور ماں اس کا کرپ نہیں جان سکتی تھیں۔ اور پھینکی سی ہنسی دی تھیں۔“

”کیا ایسی کوئی کہانی نہیں ہے جس میں ماں نہیں باپ سوتیلا ہو۔“

اور ماں سہم جاتیں، گہر جاتیں۔

”کیا تمہارے بابا نے کچھ کہا؟“

”وہ ٹہنی میں سر ہلا دیتی۔ ابانے تو کبھی کچھ نہیں

”میں تو بس یونی پوچھتی ہوں اماں، کدھر کسی  
کا باپ سویتلا ہو تو کیا پھر بھی کوئی پری..... بس یونی  
اماں، اپنے مجس کے لیے معلومات کے لیے۔“  
اماں گہری نظر سے اسے دیکھتی رہیں۔ اندر  
نیک اسے کھوجتی گہری نظریں اور وہ نظر چلا لیتی۔  
اب وہ اماں کو کیا بتانی بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ بس  
محسوسات تھے اور وہ چھوٹی سی ہنسی اپنے احساسات کو  
الفاظ پہناتے سے قاصر تھی۔ اس نے بھی اماں کی

کہا تھا۔“  
”اور بھائی..... بھائی نے تو کچھ نہیں کہا؟“  
اماں ہنوز سہی نظروں سے اسی دیکھتیں۔  
”نہیں۔“ بھلا بھائی نے کیا کہا تھا وہ تو اس کا  
راج دلا رہا تھا۔ اس سے صرف دو سال چھوٹا نجیب  
راشد۔ اسے بہت پیارا تھا۔ کیا ہوا جو باپ الگ  
الگ تھے لیکن جنم دینے والی ماں تو ایک مٹی تھی۔ وہ نفی  
میں سر ہلائے جاتی۔



”ابا تو ابا ہوتے ہیں زارو، مگے سوتیلے نہیں ہوتے۔“

”ایاں! سنڈر ریلای سوتیلی ایاں تو اس پر بہت ظلم کرتی تھی، سارے کام کروانی تھی۔ کیا سوتیلے ابا بھی ایسے ہی ہوتے ہیں ظالم اور کیا میرے ابا بھی جب میں تھوڑی بڑی ہو جاؤں گی تو سنڈر ریلای سوتیلی ماں کی طرح مجھ پر ظلم کریں گے؟“ وہ سہمی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

ان کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ ”کیا تمہارے ابا نے بھی تمہیں ڈانٹا، مارا، تھپیں بھوکا رکھا، تمہیں اچھے کپڑے بنوا کر نہیں دیے۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔  
”تو مجھ تمہارے ابا ظالم تو نہ ہوئے نا؟“ اور اس نے تائید میں سر ہلایا تھا۔

”ہاں، ابا ظالم نہیں تھے۔ ابا صرف ابا ہوتے ہیں وہ مگے سوتیلے نہیں ہوتے۔“

اس نے خود کو کبھی یقین دلایا تھا لیکن پھر بھی وہ دعا کرتی تھی کہ کسی روز کوئی شہزادہ آئے اور اسے اس گھر سے کہیں دور لے جائے جہاں ابا کی سرنہیر نظریں نہ ہوں۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی جا رہی تھی اپنے احساسات اور ابا کی بے گامگی کو سمجھنے لگی تھی۔ جب وہ غیب کو پیار کرتے اسے ہنساتے، مگد گداتے وہ اباں کے کھٹنے سے لگی حسرت سے انہیں دیکھا کرتی۔

”اپنی بیٹی ہی کو اس طرح میرے بیٹے کو گھور کر نہ دیکھا کرے۔ اسے نظر لگا دے گی۔“

ایک روز اس نے ابا کو کہتے سنا تھا اور تب سے وہ ابا کی موجودگی میں ادھر ادھر ہو جاتی لیکن جب ابا نہ ہوتے تو وہ اسے خوب پیار کرتی تھی، اس کے ساتھ کھلتی تھی اور وہ بھی ہلکے ہلکے اس کی طرف آتا تھا۔ وہ اسے بہت عزیز تھا۔ بہت پیارا تھا۔ ایاں اور ابا اسے بچو کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ تین سال کی تھی

نظروں میں اپنے لیے اپنائیت نہیں دیکھی تھی۔ جب وہ اس کی طرف دیکھتے تو ان کی نظروں میں بڑی سرد پھری سی ہوتی۔ ساٹ اجسی کی نظریں۔ انہوں نے بھی اسے گود میں نہیں لیا تھا۔ کبھی پیار نہیں کیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی آنکھوں اور چہرے سے سخت جھلکنے لگتی۔ جبکہ غیب کو وہ گود میں بھی اٹھاتے۔ پیار بھی کرتے، مگد گداتے بھی۔ باتیں بھی کرتے تھے۔ جبکہ اس سے بھی مخاطب تک نہ ہوتے تھے۔

وہ سات سال کی تھی جب اسے پہلی بار پتا چلا تھا کہ اس کے ابا اس کے مگے نہیں بلکہ سوتیلے ابا ہیں۔ وہ تب مگے اور سوتیلے کا فرق نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے بڑوں خالہ کو ایک عورت سے کہتے سنا تھا۔ خالہ کی بیٹی اس کی کنبلی تھی اور وہ بھی کبھار ان کے گھر کھیلے چلی جاتی تھی۔ اس روز بھی وہ ادھر عاشی کے ساتھ کھیلنے گئی تھی اور اس عورت نے جسے وہ نہیں جانتی تھی عاشی کی امی سے پوچھا تھا۔  
”اچھا یہ ہے راشد بھائی کی سوتیلی بیٹی۔ بہت پیاری ہے، ماشاء اللہ۔“

”ہاں جب راشد بھائی نے نامرہ سے شادی کی تو یہ تین چار ماہ کی تھی۔ نامرہ اسے ساتھ ہی لے کر آئی تھی پر راشد بھائی نے بھی پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ برائی اولاد کو پالتا آسان تھوڑا ہوتا ہے لیکن راشد بھائی مگے باپ سے بڑھ کر خیال رکھتے ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ زارو کے مگے نہیں سوتیلے باپ ہیں۔“

اور اس روز اس نے گھر آ کر اماں سے پوچھا تھا۔

”کیا ابا میرے سوتیلے ابا ہیں تو پھر میرے مگے ابا کہاں ہیں؟“

اور اماں ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔  
”کس نے یہ تم سے کہا؟“

”عاشی کی اماں ایک عورت کو بتا رہی تھیں۔“  
”اوہ!“ وہ سر کچڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔ پھر چند لمحوں

بعد انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

اسد اللہ نے بھی مڑ کر واپس نہیں آتا تھا اور راشد منیر کے لیے وہ صرف ابا کی بیٹی تھی۔

☆☆☆

وہ سر جھکائے ہاتھوں کی پشت سے اپنی پلکیں پلکیں اور کیلے رخسار پونچھ رہی تھی۔ حاجرہ دکھ اور تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ زارا اسد تھی۔

”بولو زارا۔ چپ کیوں کر گئیں؟ اپنے متعلق سب بتاؤ۔ کسی سے حال دل کہہ دینے سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ زیادہ نہ کہی کچھ تو۔“

”کیا بتاؤں آپا۔۔۔۔۔“ اس نے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔ سارا سفر ٹوٹے کاغذ پر ننگے پاؤں چلتے گزرا ہے۔“

زارا اور اس کی والدہ کو حاجرہ کے گھر میں پرچے ہوئے چہرہ ہوا ہو گئے تھے۔ لیکن ان میں بے تکلفی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک تو حاجرہ رات تک کام میں مصروف رہتی تھی۔ دوسرا جب مولوی صاحب کی سفارش پر اس نے اوپر والی منزل کرائے پر دی تھی تو مولوی صاحب نے اپنی عمرانی میں باہر گئی کی طرف بیڑھیاں بنوا دی تھیں سوان لوگوں کی آمد و رفت ادھر سے ہی ہوتی تھی۔ لیکن جب سے اسے پتا چلا تھا کہ اوپر ماں بیٹی اکیلی ہوتی ہیں اور محسوس اپنی زارا کے والد نہیں بلکہ اس کے رشتے کے ماموں ہیں۔ وہ انہیں یہاں چھوڑ کر واپس اپنے گاؤں چلے گئے تھے تو اس نے گھر کے اندر والی بیڑھیوں کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اور اب بھی کھار زارا کے جانے کے بعد اس کی والدہ نامرہ بچے آ جاتی تھیں۔ وہ محسن میں رنگائی کا کام کرتی رہتی اور وہ درآمد سے محنت پر کچھ دیر چھٹیں، ادھر ادھر کی باتیں کرتیں اور پھر چلی جاتیں، لیکن حاجرہ نے بھی ان سے ان کی ذاتی زندگی کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ نہ بھی خود سے انہوں نے بتایا کہ وہ یہاں کیوں کرائے پر گھر لے کر رہ رہی ہیں۔ کیا ان کا ذاتی گھر کوئی نہیں ہے۔ ان کے عزیز رشتہ دار شوہر۔

حاجرہ کو لگتا تھا جیسے دونوں ماں بیٹی کوئی لمبا

تب جب اس نے اسے جو کہہ کر بلایا تھا۔ اس نے قدرے دیر سے بولنا شروع کیا تھا اور اب تین سال کی عمر میں بھی وہ مکمل جملہ نہیں بول پاتی تھی۔ شاید وہ جو کچھ ٹھیک طرح سے یک نہیں کر پاتی تھی اس لیے وہ اس کا پیارا سا جو بھائی تھا۔

اماں کے جانے والے اسے خوش قسمت سمجھتے تھے۔

”تمہاری بیٹی بہت خوش قسمت ہے نامرہ۔

باپ اتنا خیال رکھتا ہے اس کا۔ حالانکہ پرانی اولاد کو اس طرح شہزادوں جیسا کون پالتا ہے؟“

اور اماں مسکرا کر کہیں۔ ”ہاں اللہ کا شکر ہے۔“

اور اس کا دل چاہتا کہ وہ حج حج کر کہے۔

اچھے کپڑے پہنی کھلونے، بہترین کھانا سپاہ کرنے

کے علاوہ بھی ایک باپ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اولاد کو اپنی محبت، شفقت اور تحفظ کا احساس دینا۔

لیکن اسے بھی نہیں لگا تھا کہ وہ اس کے بھی ابا ہیں۔

وہ ہمیشہ ایک محبت بھری نظر کی آس میں چھپ چھپ کر انہیں دیکھتی تھی لیکن انہوں نے بھی اسے ایک

باپ کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

اس کی سہیلیاں اسکول میں اپنے ابا کا ذکر کرتی

تھیں۔ کوئی بتاتی آج اس کے ابو نے یہ کہا۔ کوئی

بتاتی وہ ابو کے ساتھ سیر کرنے کے لیے مٹی تو ضد کر

کے آنکسریم کھائی۔ ابو اس کی ہر بات مانتے ہیں۔

وہ سب اپنے اپنے ابا کی لاڈلی تھیں لیکن اس کے

پاس اپنے ابا کے متعلق بتانے کے لیے کچھ نہ تھا، وہ

صرف اپنی ماں اور جو کی باتیں کرتی تھی۔

ابا نے اسے ضروریات زندگی تو مہیا کی تھیں

لیکن اس کی روح کا خلا نہیں بھرا تھا۔ اس کی روح

خالی تھی دل خالی تھا۔ وہ کبھی مکمل کر نہیں رہی تھی۔ کبھی

بہت خوش نہیں ہوتی تھی۔ نئے کپڑے، چوڑیاں

کھلونے کوئی بھی چیز اسے خوش نہیں کرتی تھی۔ وہ

جانتی تھی کوئی شہزادہ خوشی کے کمر گلابی لے کر اسے

ڈھونڈتا ہوا انہیں آئے گا کیونکہ وہ سنڈریلا نہیں تھی وہ

زارا اسد تھی اور اس کے دل کا خلا کبھی نہیں بھرا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ تو ذرا کارنگ یک دم زرد پڑ گیا۔ اور آنکھوں سے خوف جما گئے لگا۔  
 ”آپا..... پلیز کوئی اماں اور میرے متعلق پوچھے تو کچھ مت بتائیے گا۔“  
 حاجرہ نے باہر جاتے جاتے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے زارا، یہاں کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ اور کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آئی تھی۔  
 ”ہادی تھا، اس کی اماں نے پلاؤ بھیجا تھا۔“ وہ دوسری چار پالی پر بیٹھ گئی تھی۔  
 ”تمہاری اس مٹی کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال کرنے والے، ہمدرد، مخلص۔ میرے بابا کہتے تھے یہ بہت نایاب لوگ ہیں۔ آنے والے زمانوں میں ایسے لوگ کہیں نہیں ملیں گے۔ خدا نا خواستہ بھی کسی پر کوئی مشکل وقت آجائے تو یہ جان دینے سے بھی نہیں ڈرتے، اس لیے تم بے فکر رہو۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا تم کسی بے خوف زدہ ہو کر ڈر کر یہاں آئی ہو۔ کیا تمہارا کوئی دشمن ہے، اگر مناسب سمجھو تو بتا دو۔“

اور تب زارا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ اور وہ ہولے ہولے اسے اپنے متعلق بتاتے ہوئے جذباتی ہو گئی تھی اور اب سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

”اللہ جیسا سفر نصیب میں رکھ دے ویسا ہی طے کرنا پڑتا ہے۔ زارا بھلے کانتوں پر چل کر طے کریں یا پھولوں پر یہ تو اس سونے رب کے فیصلے ہیں، وہ اپنی مخلوق کو جیسے رکھے اس کی مرضی، مخلوق کا کام تو خالق کے حکم اور مرضی کے سامنے سر جھکانا ہے اس کی فرمانبرداری ہے۔“

”جی.....“ زارا نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔  
 ”میرے بابا میری پیدائش سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔ میں ان کی وفات کے چار ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ میری اماں اکلوتی تھیں اور کوئی بہن بھائی

پنڈا (راستہ) کوئی اچھی منزل طے کر کے آئی تھیں۔  
 ناصرہ کی غنچیدگی، اس کی کم گوئی، اس کی آنکھوں سے جھلکتی اداسی بتاتی تھی کہ گزشتہ زندگی میں دکھوں اور پریشانیوں سے ان کا واسطہ رہا ہے۔ زارا کسی اسکول میں حجاب کرتی تھی لیکن دو دن سے وہ اسکول نہیں جا رہی تھی۔

ناصرہ نے اسے بتایا تھا کہ اسے بخار ہے اور انہیں کام سے گاؤں جانا ہے انہیں کے خالہ زاد بھائی شمس الحق اسے لینے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی کچھ زمین ہے گاؤں میں جسے انہوں نے ٹھیکے پر دے رکھا تھا اور اب وہ اسے فروخت کر رہی ہیں تو انہیں ایک آدھ دن لگ سکتا ہے تو وہ زارا کی خیر خبر لیتی رہیں کہیں بخار زیادہ نہ ہو جائے۔“

وہ زارا کے لیے پریشان بھی تھیں اور جانا بھی ضروری تھا کہ کافی دنوں سے وہ زمین فروخت کرنا چاہ رہی تھیں لیکن مناسب کا کب نہیں مل رہا تھا۔ حاجرہ نے انہیں سلی دی تھی کہ وہ بے فکر ہو کر جائیں وہ زارا کو نیچے ہی لے آئیں گی اور اس کا خیال رکھیں گی۔ زارا بہت اچھی اور محبت کرنے والی بچی تھی۔ پچھلے دنوں جب اس کی طبیعت خراب تھی تو وہ اس کے لیے بخنی اور دلیہ وغیرہ بنا کر دے جاتی تھی۔ وہ مولوی صاحب کی ممتون تھی کہ انہوں نے ان ماں بچی کو اوپر کا حصہ کرائے پر دینے کے لیے کہا تھا۔ ان کے آنے سے دوپہر اٹھ ہو گئی تھی ورنہ دات کے وقت بھی کبھی بہت دل گھبراتا تھا۔

آج جمعہ تھا اور آج کے دن کام کی جھٹی ہوتی تھی سو ناصرہ کے جانے کے بعد وہ زارا کو نیچے ہی لے آئی تھی۔ اسے ابھی بھی بخار تھا۔ اسے اپنے کمرے میں لیٹنے کا کہہ کر وہ اس کے لیے دودھ گرم کر کے لائی۔

”یہ دودھ اور درسک لے لو زارا۔ پھر دوانی کھانا۔ میرے بابا کہتے تھے خالی پیٹ دوا نہیں کھانا چاہیے۔“  
 زارا نے دودھ کا کپ پکڑ لیا تب ہی باہر

”ریلیکس زارا..... باقی باتیں بعد میں۔ اس وقت تم آرام کرو۔ تمہاری آنکھیں نیند سے پونہل ہو رہی ہیں۔ تمہاری دوا میں شاید ہلکی نیند ہوگی تو کچھ دیر سو جاؤ۔ میں نے اتنے میں تمہارے لیے بخنی یا دلیہ بنا دی۔“

”میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا آپ۔“  
 ”ابھی نہیں چاہ رہا لیکن جب بخارا ترے گا تو پھر دل چاہے گا۔ کیا بتاؤں؟“ حاجرہ نے نرمی سے پوچھا۔

”جودل چاہے بتالیں آپ۔“ زارا نے نیکی پر سر رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔

حاجرہ دروازہ بند کرتے ہوئے کمرے سے چلی گئی تو چند آنکھوں کے پیچھے آنسو جھلنے لگے اور کتاب زعمی کے اور اق ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔

☆☆☆

وہ سنڈر پلانٹس میں وہ زارا اسد تھی۔ اس نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ وہ راشد منیر کی بیٹی نہیں تھی وہ یہ بھی جانتی تھی جان چکی تھی سو کم اور خاموش ہو گئی تھی۔ اماں سے بھی کم ہی بات کرتی تھی شاید وہ دل ہی دل میں ان سے ناراض تھی کہ انہوں نے اس کے والد اسد اللہ کے مرنے کے بعد دوسری شادی کیوں کی کیا تھا اگر وہ شادی نہ کرتیں تو زعمی کتنی خوب صورت ہوتی۔ وہ نانا نانی اور ان کے بعد دادا دادی کے ساتھ رہے۔

پہلی بار نو سال کی عمر میں وہ جو کی دادی کی وقت پر گاؤں گئے تھے اور اپنے ہوش میں پہلی بار وہ اپنے دادا دادی سے ملی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ راشد منیر کی والدہ اور جو کی دادی ہیں۔ لیکن جو کروڑے دیکھ کر وہ بھی رونے لگی تھی۔ سات سالہ جو پہلی بار اپنی دادی کو موت کے بعد دیکھ رہا تھا پھر بھی وہ رو رہا تھا اور وہ جو کے لیے رو رہی تھی۔ ایک جوی تو تھا اس کا اپنا جس سے وہ چلتی بھی تھی۔ باتیں بھی کرتی تھی اور اسکول میں بریک کے وقت بھاگ کر اس کے

نہیں تھا۔ میں ابھی تین چار ماہ کی ہی تھی کہ میرے نانا نانی نے اماں کی دوبارہ شادی کر دی۔ اماں دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن نانا نانا نے سمجھا یا کہ ہمارے بعد تم تنہا رہ جاؤ گی۔ کوئی بھائی بہن بھی نہیں ہے اور راشد اچھا لڑکا ہے۔ یوں تو اماں کے لیے گاؤں کے ایک دو اور اچھے گھرانوں سے رشتے آئے تھے۔ میری اماں بہت خوب صورت تھیں، صاحب جائیداد تھیں سو ایک بیٹی کی ماں ہونے کے باوجود لوگ خواہش مند تھے۔ لیکن نانا نانی نے راشد منیر کو ترجیح دی تھی کہ وہ میرے ابا اسد اللہ کا تایا زاد تھا۔ اور وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ میرے دادا دادی بھی یہی ہی چاہتے تھے کہ اس طرح میں ان کی نظروں کے سامنے رہوں گی۔ کہ اماں کی طرح میرے ابا اسد اللہ بھی اکلوتے تھے۔ اماں کی شادی کے دو سال بعد ہی میرے نانا نانی وقت پا گئے تھے۔ اور ابا گاؤں سے شہر آ گئے۔ نجیب تب میں چار ماہ کا تھا۔ جیسلمر میں نے آپ کو بتایا تھا۔ میں نجیب کے ابا کو ہی ابا سمجھتی تھی۔ سات سال کی عمر میں پہلی بار مجھے پتا چلا تھا کہ وہ میرے سوتیلے ابا ہیں۔ اور تب سے ہی میں وہ فرق محسوس کرنے لگی تھی جو ہوش سنہالنے کے بعد سے ہی مجھے محسوس ہوتے تھے لیکن میں سمجھ نہیں پاتی تھی۔ مجھے کیوں لگتا تھا کہ میرے ابا میری سہیلیوں کے ابا جیسے نہیں ہیں۔ جب جان لیا تو میں وہ باتیں بھی نوٹ کرنے لگی تھی جو پہلے کبھی نہیں کی گئیں۔

ابا نے کبھی مجھے مخاطب نہیں کیا تھا۔ کبھی میرا نام نہیں لیا تھا۔ اگر اباں سے میرے متعلق کوئی بات کرنا ہوتی تو کہتے ”تمہاری بیٹی“ اماں کو پتا نہیں محسوس ہوتا تھا یا نہیں لیکن میرے دل میں کہیں درد کی پھانس ہی چھ جاتی تھی۔ کیا تھا اگر وہ کہتے ہماری بیٹی یا ہماری بیٹی نہ کہتے میرا نام ہی نہ دیتے۔“  
 اس کی آواز بھرا لگی تھی وہ ہونٹ کچلنے لگی جیسے دل سے اٹھتے درد کو دبا رہی ہو۔ حاجرہ نے اٹھتے ہوئے اس کا بازو تھپتھپایا۔

دادا تو اس کے آنے کے ساتوں دن فوت ہو گئے تھے۔ وہ اگرچہ بہت بیمار تھے پھر بھی اسے گھنٹوں اپنے پاس بٹھائے ہاتھیں کرتے رہتے۔ یہی اس کے ہاتھ چومتے، بھی پیٹتے، بھی گلے لگا کر رو پڑتے۔ ”میرے اسدا اللہ کی نشانی۔“

مرنے سے پہلے انہوں نے اپنی تمام زمین اور گھر اس کے نام کر دیا تھا۔ اپنے ایک دوست کی مدد سے اس کے نام کا اکاؤنٹ کھلوایا تھا اور اپنے اسی دوست کو اس کا گارڈین بنایا تھا۔ زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی رہتی۔ انہوں نے راشد منیر پر اعتبار نہیں کیا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ اپنے اکاؤنٹ سے خود رقم نکالوا سکتی تھی۔

دادا نے نامہ سے بھی کہا تھا کہ انہیں راشد کی نیت پر شک ہے۔ جس طرح وہ اس کے والدین کا گھر اور دوسری جائیداد فروخت کر کے شہر جا کر بس گیا تھا اس سے انہیں شک تھا کہ اس کی نیت صاف نہیں ہے۔ چونکہ زارا ان کی انگوٹھی وارث ہے اس لیے وہ سب کچھ اس کے نام کر کے جا رہے ہیں۔“

دادا کے بعد وہ پھر بھی گاؤں نہیں گئے تھے۔ البتہ اب تو یقیناً جاتے ہوں گے بھی کبھی کہ ان کے والد بھائی اور بہنیں بھی وہاں۔ پھر اماں کی جوتین انہوں نے چھپے پردے میں گھسی گھسی کی فصل کا حساب کتاب بھی تو لیتا ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب ان کے والد کا انتقال ہوا گھر اور زمینیں چھ بہن بھائیوں میں تقسیم ہو گئیں تو انہوں نے گاؤں سے بالکل ہی نانا توڑ لیا۔ دو بھائی کراچی اور ایک لاہور بس گیا۔ بہنیں پہلے ہی دوسرے شہروں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ اماں کی زمین بدستور چھپے پردے دی جاتی تھی اور آمدنی دادا کا دوست انہیں بھجوا دیتا تھا۔ دادا نے اپنے دوست سراج سے جانے کیا کہا تھا کہ وہ تین چار ماہ بعد شہر آتے اس سے مل کر حال احوال پوچھتے اور کچھ رقم اسے دے جاتے۔

”یہ لو بچے یہ میسے رکھ لو۔ اپنی پسند کی کچھ

پاس جاتی تھی اور پھر پوری بریک اس کی انٹلی پکڑ کر اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتی۔ اس کا بچ باکس کھول کر اسے اپنے ہاتھوں سے بچ کھلاتی۔ اور وہ بھی گھر میں اسکول میں ہر جگہ اس کے ارد گرد پھرتا پھرتا۔ اماں کے آنے پر وہ ادھر ادھر کہیں ہو جاتی تو زارو..... زارو کرتا ہوا اسے ڈھونڈتا پھرتا۔

وہ نجیب راشد تھا۔ اماں کا بچہ اور اس کا جو۔ اس کی دادی مرچ تھیں، وہ دور ہاتھ تو اس کا رونا تو بننا تھا۔ وہ دور ہی تھی تو اس میں خاتون نے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اس کے آنسو پونچھے تھے۔ اسے پیار کیا تھا۔ یہ اس کی دادی تھیں۔ اس کے ابا اسدا اللہ کی اماں۔ وہ تین دن وہاں رہے تھے اور ان تین دنوں میں دادا اور دادی نے اسے اتنا پیار کیا تھا اتنی محبت دی تھی کہ اس کا بچہ چاہا تھا وہ ہمیشہ یہاں ہی رہ جائے دادا اور دادی کے پاس۔ جہاں اب کی وہ سرد مہر نظر نہیں ہوں۔ دادی نے اماں سے کہا بھی تھا کہ وہ اسے کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس ہی چھوڑ جائیں اور اماں کچھ کچھ راضی بھی ہو گئی تھیں لیکن جوتیوں میں جھاڑ بھاڑ کر اور تانیں چلا چلا کر دیا تھا کہ اماں گھبرا گئی تھیں۔ وہ کسی صورت اسے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور وہ بھلا اس کا رونا کہاں برداشت کر سکتی تھی سو واپس شہر آ گئی تھی۔ لیکن اسے دادی اور دادا بہت یاد آتے تھے۔

اماں نے دادی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چھٹیوں میں اسے لے کر آئیں گی لیکن چھٹیوں سے پہلے ہی دادی فوت ہو گئیں۔ دادی کی وفات پر وہ صرف دو دن کے لیے گاؤں گئے تھے۔ اور جب وہ گیارہ سال کی تھی تو دادا بھی چند دن بیمار رہ کر فوت ہو گئے تھے۔ جب وہ بیمار تھے تو ان کے اصرار پر اماں اسے ملانے کے لیے گاؤں لے کر گئی تھیں۔ وہ نجیب اور اماں ہی گئے تھے۔ نجیب کے چاچا انہیں لینے آئے تھے۔ وہ دادا سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے دادا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چھٹیوں میں ان کے پاس رہنے کے لیے آئے گی اور بہت سارے دن رہے گی۔ لیکن



جیز لینا جا ہوتا ہے لیکن۔“

لیکن اسے تو کچھ نہیں لینا ہوتا تھا۔ سب کچھ اسے لے لیا جاتا تھا۔ وہ ان کے جانے کے بعد پیسے اماں کو دے دیتی تھی۔ راشد منیر نے اس کی سب سے خیر و برکتیں پوری کی تھیں بس باپ کی محبت نہیں دی تھی۔ تو دل پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ ان کے دل میں بھی اس کی محبت پیدا نہیں ہو سکی تھی تو کیا ہوا۔ اس نے خود کو سمجھا لیا تھا۔ اسے تو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ انہوں نے اسے زندگی کی سیاری سہولیات مہیا کی تھیں سو وہ ان کی احسان مند تھی۔ اسی لیے اس نے بی۔ اے کے بعد حریہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ نامرہ چاہتی تھی کہ وہ اپنے کسی پسندیدہ مضمون میں ایم۔ اے کر لے اور اس کے لیے اسے لاہور جا کر پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا تھا۔ اور ظاہر ہے اس کے لیے اسے ہوسٹل میں رہنا پڑتا۔ اور ابانے پہلے ہی اس پر بہت خرچ کیا تھا۔ اور یہ فیصلہ اس نے بی۔ اے کے امتحان سے پہلے ہی کر لیا تھا کہ اسے اب حریہ نہیں پڑھتا۔ کیونکہ ایک روز اس نے ابانے کو کسی سے کہتے سنا تھا کہ ”انہوں نے اس پرانی بچی پر لاکھوں خرچ کیے ہیں۔ اور اس کا وہ جالاک دادا۔۔۔۔۔۔“

پوری بات وہ نہیں سن سکی تھی۔

اگرچہ دادا جب فوت ہوئے تھے تو وہ گیارہ سال کی تھی لیکن دادا نے اس کے دستخط کیوں کروائے تھے اس کے کچھ ذہن میں نہیں تھا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ بینک میں اس کا اکاؤنٹ ہے اور اس میں جو رقم ہے وہ اس کی ہے مودہ اسے اپنی تعلیم پر خرچ کر سکتی ہے۔ اس نے اماں اور نجیب کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیوں حریہ پڑھنا نہیں چاہتی۔ نجیب ناراض بھی ہوا تھا۔

”زارا! تم اتنی لائق ہو، اتنی ذہین۔ پھر کیوں نہیں ایڈمیشن لے رہیں۔“

”بس میرا دل نہیں چاہتا۔“ اس نے نظریں چرائی تھیں اور آنسو اندر اتار لیے تھے۔

اس کی سہیلیاں عاشی اور راحت نے پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا اور لاہور چلی گئی تھیں۔ اس نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا۔ گھر میں اب وہ تین فرد ہی تھے نجیب کو بچپن سے ہی آری میں جانے کا شوق تھا سو وہ کامیاب ہو کر کاکول چلا گیا تھا۔ وہاں جا کر بھی وہ ہر خط میں اسے حریہ پڑھنے کے لیے اکساتا رہتا تھا۔

”ایک سال ضائع ہو گیا تو کوئی بات نہیں ہے۔ اگلے سال ایڈمیشن لے لینا۔ ویسے بھی تم نے ایک بار سال میں دو کلاسیں انٹرمیڈیٹ کی تھیں۔ چوتھی کے بعد اماں نے تمہیں دوسرے اسکول میں آٹھویں میں داخلہ دلایا تھا۔“

اس کی یادداشت ابھی تھی اسے پرانی باتیں یاد رہتی تھیں جبکہ وہ اکثر بھول جاتی تھی۔ نجیب کے خط پڑھ کر ایک بار تو اس کے دل میں ہوک سی انٹرمیڈیٹ لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اس پر قائم تھی۔

☆☆☆

وقت کا کام تو گزرتا ہوتا ہے سوتیزی سے گزر رہا تھا۔ نامرہ چاہتی تھی کہ اب اس کی شادی کر دی جائے لیکن کوئی اچھا رشتہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی۔ صاحب جانداد بھی پھر بھی جانے کیا رکاوٹ تھی کہ بات بنتے بنتے بگڑ جاتی تھی۔ نامرہ اس کے رشتے کی وجہ سے پریشان تھیں۔ ایسے میں نجیب کی پانگ آؤٹ پریڈ کا دن آ گیا۔ نجیب نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب وہ اس کی پانگ آؤٹ پریڈ پر آئے گی تو وہ اسے سارے اعبت آباد کی سیر کرائے گا۔ اگر وقت ہوا، کوئی مسئلہ نہ ہو تو وہ بالاکوٹ اور نارائن بھی جائیں گے وہ بہت خوش تھی۔

وہ اپنے گھر سے بھی باہر نہیں گئی تھی۔ اس نے اپنے شہر کے علاوہ کوئی دوسرا شہر نہیں دیکھا تھا۔ بس دوبار گاؤں گئی تھی۔ لیکن ابانے اسے ساتھ لے جانے سے منع کر دیا۔ نامرہ نے بحث کی تو اسے ڈانٹ دیا۔

”بس میں نے کہہ دیا کہ نہیں جائے گی تو بس



علاقہ دیکھ رہی تھی اور بہت خوش تھی۔  
 ”اگر تم دو دن رک جاؤ تو میں تمہیں بالاکوٹ  
 اور ناران لے جاؤں گا۔ جھیل سیف الملوک اور  
 شوکراں کو دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گی۔“ وہ الیاسی مسجد  
 دیکھ کر واپس آ رہے تھے جب نجیب نے کہا تھا۔  
 ”میرا رک جاتے بیٹا، لیکن تمہارے ابا  
 دوسروں کے گھر پڑے ہیں۔ کلثوم کا بھی سرال ہے  
 کون سا اپنا گھر ہے۔ اگر تمہارے دوست کے  
 والدین نے رات ٹھہرا نہ ہوتا تو ہم آج ہی نکل  
 جاتے۔ اور تمہارا ارادہ بھی ابھی چند دن بعد آنے کا  
 ہے۔“ نامرہ نے جواب دیا تھا۔

”چلیں پھر بھی سہی، میں زارا کو یہ سارا علاقہ  
 دکھاؤں گا۔“

نجیب دیکھ رہا تھا کہ وہ بہت خوش تھی۔ وہ انہیں  
 اپنے دوست کے بچے کے گھر چھوڑنے سے پہلے ایک  
 جگہ جانے پلانے لے آیا تھا۔

”یہاں کی جانے بہت اچھی ہوتی ہے۔“  
 ”کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر جانے پینا اسے  
 بہت اٹو کھا لگ رہا تھا۔ کافی سارے لوگ ادھر ادھر  
 میزوں پر بیٹھے چائے اور پیڑر سے لطف اندوز ہو  
 رہے تھے۔“

”کیا ان کے گھروں میں چائے نہیں بنتی جو کہ  
 اتنے سارے لوگ چائے پینے یہاں آئے ہوئے  
 ہیں۔“ وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”ان میں زیادہ تر تو سیاح ہیں۔ چائے پی کر  
 یہ لوگ آگے بالاکوٹ کے لیے نکل جائیں  
 گے۔ لیکن کچھ لوگ یوں ہی شوقیہ بھی چائے پینے  
 آ جاتے ہیں۔ صرف انجوائے منٹ کے لیے۔“  
 ”نجیب اس کی حیرانی سے محظوظ ہو رہا تھا۔

تب ہی کوئی ان کی میز کے پاس آ کر رکا تھا۔  
 نجیب فوراً اٹھ اہو گیا تھا۔

”السلام علیکم۔“  
 ”علیکم السلام۔ کامیابی مبارک ہو۔“  
 ”تھنک یو کیپٹن۔“

نہیں جائے گی۔ اول تو ہم رات کو واپس آ جائیں  
 گے اور اگر رات رک بھی گئے تو عاشی کی ماں کو کہہ دینا  
 رات اس کے پاس آ جائے گی۔“

اور وہ جواناں کے ساتھ بازار جانے کو تیار ہو  
 رہی تھی کہ وہاں جانے کے لیے نیا جوڑا لے لے  
 راشد منیر کی بات سن کر خاموشی سے بچن میں چلی گئی  
 تھی۔ اماں نے ان سے کیا کہا تھا۔ اسے معلوم نہیں  
 تھا۔ لیکن بچن میں کام کرتے ہوئے بھی اس کی  
 آنکھیں بار بار نم ہوتی رہیں۔ لیکن کچھ فیصلے اوپر  
 ہوتے ہیں اور انسان کے کیے گئے فیصلے اور ارادے  
 دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

راشد منیر کلثوم پیمپو سے ملنے گاؤں گئے تھے  
 کہ وہ ان دنوں گاؤں اپنے سرال میں آئی ہوئی  
 تھیں۔ راشد منیر کو اپنے بہن بھائیوں میں سے اگر  
 کسی سے کچھ لگاؤ تھا تو وہ کلثوم ہی سب سے چھوٹی۔  
 وہ گاؤں میں ٹیکسٹر سے کرکرائی ٹانگہ تروا بیٹھے تھے  
 اور اب قصبے کے ہاسٹل میں داخل تھے۔ انہوں نے  
 کلثوم پیمپو کے دور کے بچنے کے ہاتھ اماں کو پیغام  
 بھیجا تھا کہ یہ نجیب کی زندگی کی پہلی بڑی خوشی ہے اور  
 اگر اس کے گھر والوں میں سے کوئی نہ گیا تو اس کا دل  
 رکھے گا لہذا وہ نجیب کے دوست کے والدین کے  
 ساتھ پروگرام بنائیں جانے کا۔ اور اماں نے اسے  
 بھی تیار ہونے کا کہہ دیا تھا۔

”ابا ناراض ہوں گے!“ اس نے ڈرتے  
 ڈرتے کہا تھا۔

”ہوتے رہیں.....“ انہوں نے کندھے  
 اچکائے ”تمہیں ساتھ لے کر نہ گئی تو نوجو ناراض ہو  
 جائے گا اور اس کی خوشی ادھوری رہ جائے گی۔“

یوں وہ نوجو کے دوست کے والدین کے ساتھ  
 کاکول آئے تھے۔ چونکہ راشد منیر کو کلثوم پیمپو پلاسٹر  
 چڑھاوے گھر لے گئی تھیں۔ اور یہ اس کی اب تک کی  
 زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا۔ نجیب فٹکشن  
 کے بعد انہیں گھمانے لگ گیا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی  
 بار یوں گھر سے نکلی تھی اور پہلی بار اتنا خوب صورت

طلسماتی کشش تھی کہ وہ بھول ہی نہیں پاری تھی۔ جس شخص سے شاید اسے پھر زندگی میں ملے گی نہیں ملنا تھا۔ اس کا اس کی طرف دیکھنا، اس کی نظروں کا اس کے چہرے کے گرد طواف کرنا۔ اسے سونے سے پہلے ہی نئی دیرینک مضطرب رکھنا تھا۔

ان کے واپس آنے کے دو دن بعد لہا گاؤں سے واپس آ گئے تھے۔ ناگ پر پلاسٹر چڑھا تھا۔ سو گھر پر ہی رہتے تھے۔ اسٹور کا کام ملازم لڑکا ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے غموں کیا تھا کہ وہ اماں سے کچھ کہتے کہتے رک جاتے تھے۔ آخر نجیب کے آنے کے بعد انہوں نے دوپٹا کچھ دی جسے کہتے ہوئے جھک رہے تھے۔ وہ بچن میں بھی جب اس نے انہیں کہتے سنا۔

”میں نے زارا کا رشتہ طے کر دیا ہے۔“  
”کس سے؟“ ناصرہ حیران ہوئی تھیں۔ ”مجھ سے پوچھتے بغیر۔“

”کیوں کیا وہ میری بیٹی نہیں ہے۔ میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ آپ کا حق نہیں ہے۔ لیکن میں ماں ہوں۔ مجھ سے پوچھتے بغیر آپ کیسے میری بیٹی کا رشتہ طے کر سکتے ہیں۔“ وہ پریشان ہوئی تھیں۔

”جیسے بھی، اب کر دیا ہے۔ نمبر دار صوبہ خان کے بیٹے اکبر خان سے۔“

”کیا کرتا ہے؟“ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے یا نہیں؟“ نجیب نے پوچھا تھا ناصرہ تو ہکا بکا سی بیٹھی تھیں۔

”کرنا کیا ہے اس نے! باب دادا کی زمین جائیداد ہے۔ گھر بیٹہ کرکھاتا ہے اور گاؤں میں رہ کر بھلا کیا پڑھنا لکھنا تھا اس نے۔ اکھوتا لاڈلا بیٹا ہے صوبے خان کا پڑھ لکھ کر کیا کرنا تھا، کون سا نوکری کرنا تھی۔“ راشد منیر نے لاپرواہی سے کہا۔

”لیکن ابا! آپ تو سالوں بعد گاؤں جاتے

نجیب نے اس کی اور ناصرہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”مائی مدر اینڈ مسٹر۔“

اس نے غوراً سا سرخم کر کے انہیں آداب کہا۔ ”اور اماں یہ کیپٹن طاہر ہیں۔ یہاں ہی آج کل ان کی پوسٹنگ ہے۔ ایک بار میں بہت بیمار ہو گیا تھا تو انہوں نے میرا بہت خیال رکھا تھا۔“ اب وہ اس کا تعارف کروا رہا تھا۔

”جیسے رہو بیٹا!“ ناصرہ نے اسے دعا دی تھی۔ ”آپ آج رات ڈنر میرے ساتھ کریں، کیا خیال ہے نجیب۔“

”ٹھیک پھر۔“ وہ مودب ہوا تھا۔

”آج رات کا کھانا انہوں نے نادر کے چچا کے گھر کھانا ہے۔ رات وہاں ہی رکیں گی۔ اور صبح نادر کے کامی ابو کے ساتھ ہی واپسی ہوگی۔“

”اوہ..... تو پھر چائے میری طرف سے کہ یہ

ہمارے شہر میں مہمان ہیں۔“  
کیپٹن طاہر کسی کمیٹ کر بیٹھ گیا تھا اور اشارے سے چائے وغیرہ سرو کرنے والے لڑکے کو بلا کر چائے کے ساتھ کچھ اور لوازمات بھی لانے کو کہا تھا۔

وہ ذرا سا جھنجھلائی تھی۔ خواہ مخواہ لہوڑا ہو رہا تھا یہ کیپٹن طاہر بھی۔ اس نے نظریں اٹھائیں۔ وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ کیسی گھور سیاہ آنکھیں تھیں اور ان سیاہ آنکھوں سے جیسے بجلیاں سی نکلتی تھیں لہو۔ پھر تو وہ نظریں ہی نہ ہٹا سکی تھی۔ پھر لگا نہیں جھکا کر اپنی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو کینے لگی تھی اور لکڑیوں پر غم کی سکراہٹ لے لے وہ ناصرہ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ اپنی فیملی کے متعلق بتاتے ہوئے گاہے گاہے اس کی نظریں اس کی طرف اٹھیں اور پھر جیسے چند ثانیے کے لیے وہاں ہی ٹھہر جاتیں اور اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔

گھر آ کر بھی یہ گھور سیاہ آنکھیں اس کے تصور میں آتی رہیں اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔ کیسا سحر تھا ان سیاہ آنکھوں میں اور کیسی

رشتہ اس جواہری اور شرابی سے نہیں کرنا آپ انکار کر دیں۔ اور بھلا یوں بھی رشتہ طے کیا جاتا ہے کیا۔ نہ اماں نے اس لڑکے کو دیکھا نہ ملیں اور آپ بات طے کر آئے۔“ وہ بے حد ناراض ہو رہا تھا۔

”میں نے دیکھ لیا تھا کافی تھا۔ جب منگی کے لیے یہاں آتا تھا رہاں اماں بھی دیکھ لیتیں تم بھی مل لیتے۔“ راشد منیر جھجھلائے تھے۔

”مہر حال اب آپ صاف انکار کھلوا بھیجیں انہیں۔ چھوٹے سرال والے تو حیران ہو رہے تھے آپ نے ان سے بھی ذکر نہیں کیا۔ ورنہ وہ آپ کو بتاتے کہ پورے گاؤں میں کوئی اکبر خان کو رشتہ نہیں دیتا۔“ نجیب نے حسی اعزاز میں کہا تھا۔ ”زارا کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔“

اس بار راشد منیر خاموش ہو گئے تھے۔ اور وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اب لایا انکار کر دیں گے۔ پھر بھی اس نے جانے سے پہلے زارا کو بھجایا تھا۔

”وہ بے ثواب لایا ایسا کچھ نہیں کرنے والے۔ لیکن اگر انہوں نے تمہارا رشتہ وہاں ہیں طے کرنا چاہا تو صاف انکار کر دینا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ابا سے بالکل بھی۔ وہ اماں اور تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔“

اور راشد منیر کو ایک بار پھر انکار کرنے کی تاکید کر کے نجیب چلا گیا تھا۔ اس کی پہلی پوسٹنگ کھاریاں میں ہوئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد راشد منیر نے ناصرہ سے کہا۔

”وہ زبان دے چکا ہے اور زبان سے نہیں پھرے گا۔ اور ساری زندگی تمہاری بیٹی کو اس لیے پال پوس کر بڑا نہیں کیا کہ وہ دس لوگوں میں میرا سر جھکا دے۔“

وہ راشد منیر کی احسان مند تھی۔ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی لیکن اس نے اسے سبکی اولاد کی طرح ہی بہترین اسکولوں میں پڑھایا۔ بہترین کپڑے مہیا کیے ہر ضرورت ہر خواہش پوری کی۔ ثواب اگر اس

ہیں کیا خبر کس مزاج کا ہے۔ کس طرح کا کردار ہے؟“

نجیب کو فکر ہو رہی تھی۔ اسے ان کا اس طرح ناصرہ سے پوچھے بغیر زارا کا رشتہ طے کر دینا اچھا نہیں لگتا تھا۔

”اوہ پتر! میں نے سب پتا کر لیا تھا سب نے تفریق ہی کی۔ راشد منیر نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نجیب کو پھر بھی تحفظات تھے۔“

”زارا تو شہر میں رہنے کی عادی ہے ابا، وہ گاؤں میں نہیں رہ سکے گی۔“

”لو بھلا گاؤں اور شہر میں اتنا کہاں فرق رہ گیا ہے۔ اب جب سے وہاں بجلی آئی ہے سب کھیتیں بھی ہیں۔ زارا بہت خوش رہے گی، تم ویسے ہی پریشان ہو رہے ہو۔“ وہ جانتے تھے کہ نجیب کو زارا سے بہت محبت ہے۔

اس وقت تو نجیب خاموش ہو گیا تھا لیکن دوسرے دن انہیں بتائے بغیر وہ گاؤں چلا گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ کٹھن پیچھو سے بھی مل لے گا۔ اور اکبر خان سے بھی۔ وہاں آیا تو موڈ بہت خراب تھا۔

”کیا گاؤں میں کسی نے آپ کو نہیں بتایا کہ اکبر خان کی راتیں لاہور کے شاہی محلے میں اور دن جوار پول کے اڈے پر گزرتے ہیں۔“

”میں کسی نے غلط بتایا ہے نجیب پتر۔“ وہ ذرا سا شپٹائے تھے لیکن فوراً ہی سچل گئے تھے۔

”اور یہ کہ وہ باپ دادا کی ساری زمین اور جائیداد عیاشی کی نذر کر چکا ہے۔ سوائے ایک گھر کے کچھ بھی نہیں بچا۔ اور اس کی پہلی بیوی کیسے خون تھوک تھوک کر مری ہے اور عمر میں بھی وہ اپنی زارا سے کافی بڑا ہے۔“ نجیب نے جیسے ان کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

”ہاں مگر کبھی سوالا لاکھ کا ہوتا ہے۔“ راشد کو افسوس ہو رہا تھا کہ خواہ خواہ نجیب کے سامنے اس رشتے کا ذکر کیا۔

”سوالا لاکھ کا ہو یا دس لاکھ کا مجھے اپنی بہن کا

نے اس کی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کیا تھا تو اس کا فرض تھا کہ وہ اس کے فیصلے پر سر جھکا دے۔ اور اس نے سر جھکا دیا تھا۔

☆☆☆

ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے آنکھیں ہار بارہم ہو جاتیں اور نگہ پھینکنے لگتا تھا۔ جانے کب تک اس کی آنکھیں یوں ہی موتی روتی رہیں کہ حاجرہ نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کیسی طبیعت ہے اب زارا۔ میں نے دلیہ بنا دیا ہے کھوتو لے آؤں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تم روری تمیں زارا“ حاجرہ کو دکھا ہوا۔

”عمر بھر کا رونا ہے آپا۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں اور گیلیے رخسار پونچھے۔

”اللہ نہ کرے زارا کہ تم عمر بھر روؤ۔ اللہ تمہیں بہت ساری خوشیاں دے۔“ حاجرہ کے لبوں سے بجا اختیار نکلا۔

”اب ایسی کوئی امید نہیں ہے آپا کہ زندگی میں کبھی کوئی خوشی ملے گی۔ سچ کہا ہے میں نے آپا۔ اب تو عمر بھر کا رونا ہے۔“ وہ بے حد دل گرفتہ اور مایوس لگ رہی تھی۔

”اس طرح نہیں کہتے زارا۔“ حاجرہ نے تنبیہ کی۔

”نا امید تو صرف شیطان ہوتا ہے۔ مایوسی کفر ہے۔“

”جب سب کچھ واضح اور صاف ہو تو پھر کوئی امید بھی دل میں کسے پیدا ہو۔ جب آپ کو پتا ہو کہ آگے آپ کے لیے کچھ اچھا نہیں ہے تو!“ اس کی سوالیہ نظریں حاجرہ کی طرف اٹھیں۔

”زارا.....“ حاجرہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے خود کہتا ہے۔ ”لا تھطو۔“ زندگی میں اکثر بہت سی مشکلات آ جاتی ہیں لیکن کہیں نہ کہیں اس رب نے تمہارے لیے کوئی آسانی بھی رکھی ہوگی۔ بس تم اس طرح مایوسی کی باتیں مت کرو۔ میرا دل کہتا ہے تم نے جو بھی دکھ ہے جس میں غم

دیکھے ہیں ان کے بعد ضرور خوشی دیکھو گی۔ تم مجھے اپنے حقائق بتا رہی تمیں اب اگر کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو تو بتاؤ شاید میں تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔ نہ بھی کر سکی تو دعا تو کر سکتی ہوں۔ اور مجھ سے سب کچھ کہو گی تو تمہارے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔“

”دعا میں، کوئیں سب بے کار ہیں آپا۔“ وہ از حد مایوس تھی۔ ہاں دل پر بہت بوجھ ہے۔ کہہ دینے سے شاید ہلکا ہو جائے کچھ۔“ میں نے آپ کو بتایا تھا تا میرے اس بوجھ تلے تھے۔“ وہ سر جھکائے ہوئے ہوئے بول رہی تھی اور حاجرہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ میں نے لبا کی بات مان لی آیا، اور ان کا فیصلہ قبول کر لیا۔“ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔

”کیوں زارا..... جبکہ تمہارے بھائی نے تمہیں منع کیا تھا۔ تمہارے پاس انکار کا حق تھا اور تمہارے بھائی نے بتایا تھا تمہیں کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ حاجرہ نے پوچھا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔

”ہاں..... میں انکار کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے نہیں کیا۔ کیونکہ میری گردن احسان مندی کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔ ابانے میری پرورش کی تھی اور میرا فرض بننا تھا کہ میں ان کے فیصلے کا احترام کر کے اس احسان کا بوجھ کچھ کم کر لوں جو ابانے کیا تھا۔ ان دنوں وہ آتے جاتے میرے پاس رک کر مجھے جتاتے تھے۔

کہ انہوں نے میری تعلیم اور پرورش پر کتنا خرچ کیا حالانکہ میں ان کی بیٹی نہیں تھی۔ میں اگر انکار کر دیتی تو اماں میرا ساتھ دیتیں کیونکہ وہ متذبذب تھیں۔ انہوں نے ابھی تک اکبر خان کو نہیں دیکھا تھا۔ چیری ہاں کے بعد وہ گاؤں جا کر اس سے ملنا چاہتی تھیں۔ اس کے والدین حیات نہیں تھے بس ایک دادی تھیں، اماں جا کر ان سے ملنا چاہتی تھیں اور جیسا کہ طریقہ ہوتا ہے گھر وارد دیکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن ابانے اس کی دادی کی شدید بیماری کا داویلا کر کے کچھ ایسی جلدی بچائی کہ اماں کچھ بھی نہ کر سکیں۔ تاہم وہ مسلسل ابانے سے ہمتی رہیں کہ جو کو اطلاع دیں اسے

مجھے دیکھ دیکھ کر شغنی آجیں بھرتی رہیں۔  
”تیرے ماں باپ نے بڑا ظلم کیا کڑیے۔ اس  
لوہر لنگے کے لیے باندھ دیا۔ بیو (باپ) تو سوتا تھا  
ماں تو سکی گئی تیری۔“

دادی اسی گاؤں میں رہتی تھیں، اماں ابا کے  
مطلق سب جانتی تھیں۔ کیا میں نے ابا کی بات مان  
کر غلطی کی۔ میں نے خود سے پوچھا تھا لیکن اگر غلطی  
بھی تھی تو مجھے اسے نباہنا تھا مجھے بھی۔ لیکن میں جانتی  
تھی اسے نباہنے میں، خود میں ختم ہو جاؤں گی۔  
صرف تین دن آ پآ..... صرف تین دن وہ میرے  
ساتھ ٹھیک رہا۔ نری سے بات کرتا۔ شکل و صورت  
ٹھیک تھی۔ گو عمر میں مجھ سے بارہ سال بڑا تھا لیکن  
میں مطمئن ہو گئی تھی کہ یہ شخص اتنا بھی برا نہیں ہے  
گزارہ ہو جائے گا۔ لیکن چوتھے دن اس نے مجھے  
کہا۔ اسے لاہور جانا ہے۔ وہ مجھے ہیکے چھوڑتے  
ہوئے چلا جائے گا۔ اور چھ سات دن بعد واپس  
آتے ہوئے لے آئے گا۔ جس اماں کے لیے بہت  
اداس ہو رہی تھی۔ زعمی میں پہلی بار اس سے جدا  
ہوئی تھی۔ ویسے کی تقریب نہیں ہوئی تھی۔ ابا نے  
اماں کو پتا نہیں کیا کہ یہ مطمئن کیا تھا لیکن یہاں اس  
نے دادی سے کہا تھا کہ اس کے پاس فضول پیسے نہیں  
ہے کہ لوگوں کو کھانا کھلاتا پھرے۔

”لیکن تم نے شادی کی ہے اکبر! ولیم تو سنت  
نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اب کسی نے تجھے  
رشتہ دے ہی دیا ہے تو سدا سدا۔“

سوا اماں گاؤں میں آئی تھیں اور میں مگر جانے  
کا سن کر بے حد خوش ہو گئی تھی۔ اور اسی خوشی میں  
پوچھ بیچ تھی کہ وہ لاہور کیوں جا رہا ہے کیا کوئی کام  
ہے اسے اور جواب مجھے پھڑکی صورت میں ملا تھا۔  
”میں کیا کرتا ہوں، کہاں جاتا ہوں، آج کے  
بعد مجھ سے سوال نہ کرنا۔“

میرا سر گھوم گیا تھا۔ رخسار برجن ہو رہی تھی  
مجھے کبھی کسی نے اتنی تک نہیں لگائی تھی نہ اپاں نے نہ  
ابا نے۔ تکلیف کی شدت سے میرے آنسو نکل آئے

بلا میں۔ ایک ہی بھائی ہے اور وہ بھی بہن کی شادی  
میں شریک نہ ہو۔

”اطلاع مجھوادی ہے فوجی آدمی ہے اس طرح  
چھٹی نہیں ملتی اسے مل گئی ہو آجائے گا۔ تم فکر نہ  
کرو۔ مجھوادی ہے اکبر خان کو جلدی ہے۔“

میں نہیں جانتی ابا نے اماں کو کیسے متایا، کیسے  
بلا کیا کہ نجیب کے آنے سے پہلے ہی میرا نکاح اور  
رخصتی کر دی۔ بارات میں صرف چھ مردے اور دو  
تین عورتیں۔ ہر ماں کی طرح اماں نے بھی میرے  
پیدا ہونے ہی میرے جھڑکے لیے چیزیں اسکی  
کرتی شروع کر دی تھیں سو جلدی شادی کرنے  
میں کچھ زیادہ مسئلہ نہ ہوا۔ ہماری طرف سے محلے کے  
کچھ لوگ تھے کھانے کا انتظام ابا نے مگر میں ہی کر لیا  
تھا۔ اماں آخری وقت تک نجیب کا پوچھتی رہیں۔  
ابھی آیا نہیں۔ کب آئے گا اور ابا انہیں سلی دیتے  
رہے۔ میں جانتی تھی کہ ابا نے نجیب کو اطلاع ہی نہیں  
دی ہوگی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ بھی اس شادی  
کے لیے رضامند نہ ہوتا کچھ اس طرح اپنی شادی  
پر نجیب کے نہ آنے کا دکھ تھا پھر بھی میں نے خود کو بہلا  
لا تھا کہ اچھا ہوا وہ نہیں آیا وہ ابا کے ساتھ اس کا  
جھگڑا ہو جاتا۔ وہ ایسا ہی تھا غلط بات پر بھی کپڑا مائر  
نہیں کرتا تھا۔

میں اکبر خان کے ساتھ رخصت ہو کر اس کے  
گھر آ گئی جہاں صرف ایک بوڑھی دادی اور ملازمہ  
کے کوئی نہیں تھا۔ دادی کو تو اس شادی کا علم تک نہ  
تھا۔ وہ مجھے اکبر خان کے ساتھ دیکھ کر حیران ہوئیں۔  
”میری بیوی ہے۔ اسد احوال کی بیٹی ہے۔  
ایسے آنکھیں بھاڑ کر نہ دیکھیں۔ بیاہ کر لایا ہوں  
آپ کو نو میرا خیال نہیں تھا اس لیے مجھے خود ہی.....“  
وہ بول رہا تھا اور میرا دل جیسے ڈوب رہا تھا۔

”اچھا، اب اسے میرے گھرے میں نے  
جائیں۔ میں ذرا دوستوں کی طرف جا رہا ہوں۔  
مجھے تک آ جاؤں گا۔“

وہ مجھے دادی کے حوالے کر کے چلا گیا اور دادی

قلم کیا اس بچی پر، کس شخص کے لیے باندھ دیا۔ مجھ سے ہی پوچھ لیا ہوتا۔ ساتھ والے گاؤں میں ہی تو رہتا تھا۔ اور اس اکبر خان کو تو آس پاس کے سارے گاؤں ہی جانتے ہیں۔

اماں بس روئی رہیں کیا کہیں۔  
”محبیب کے ابا نے ہی رشتہ طے کیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ ایسا ہے۔“

”وہ راشد کی نہیں تمہاری بیٹی تھی ناصرہ۔“  
سراج بابا نے حد تک ہورہے تھے۔

”اب جو ہو گیا سو ہو گیا چاہا، بس آپ دعا کریں کہ وہ اس کے حق میں اچھا ہو۔“  
اماں اور کیا کہیں۔

”دعائیں تو کروں گا ہی، لیکن دعائیں اس کا کچھ نہیں کرنے والی۔ ماں باپ دعائیں کرتے مر گئے۔ بوڑھی دادی ہر وقت جاہ نماز پر بیٹھی دعائیں مانگی رہتی ہے۔ کوئی درگاہ کوئی دربار نہیں چھوڑا اس نے جہاں اس کے سدھرنے کے لیے منت نہ چڑھائی ہو۔ لیکن سب زمین جائداد بیچ کر اڑادی ہے۔ گھر بھی دادی کے نام ہے ورنہ کب کا بیچ چکا ہوتا۔

دادی کے سببے بھائی بھائے ہیں ان سے ڈرتا ہے۔ وہ دادی کے حصے کی فصل اور پیسہ بھجواتے ہیں جس سے گھر چل رہا ہے۔ موقع ملے تو وہ رقم بھی چرا کر لے جاتا ہے۔ میرا مشورہ تو ہے کہ طلاق لے لو۔۔۔۔۔ اور کہیں کسی اچھی جگہ اس کا رشتہ کر دو۔ زمین کے کاغذات اس کے دادا کی وصیت کے مطابق اس کی شادی کے بعد اس کے حوالے ہی کرنے تھے۔

بینک میں موجود رقم بھی یہ جب چاہے جس وقت چاہے نکلوا سکتی ہے بس ایک بار اسے ساتھ لے کر بینک جاؤں گا اسے عرض سے آیا تھا۔ لیکن اس بجٹ سے ذرا بھی مبر نہ ہوا اور شادی کے چوتھے دن ہی اس سے کاغذات مانگنے لگا۔ لیکن اسے ہرگز اس کی بات نہیں مانتی۔“

سراج بابا نے دکان پر جا کر اماں کو بھی خوب سنائی تھیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں

”اب ٹسوے بھانے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں تیرے دادا نے جو زمین تیرے نام کی تھی اس کے کاغذ لے کر آنا۔ اور تیرے ابا نے بتایا تھا کہ زمین کی ساری آمدنی تمہارے نام سے بینک میں جمع ہوتی رہتی ہے تو وہ بینک کی کاپیاں شایاں بھی لے آنا۔ اب شادی ہو چکی ہے تمہاری۔ کئی ایرے غیرے کو مختار بنانے کی ضرورت نہیں رہی تمہیں۔ میں خود دیکھ لوں گا سب۔ بڑی جیتی زمین ہے تیری، سونا کتنی ہے۔“

شاید میری زمین اور سراج بابا کے حلق ابا نے اسے بتایا ہوگا۔ میں تو پھڑکے مددے میں بیٹھی تھی اس لیے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن یہ تو ابتدائی حاحرہ آ یا۔ اس کے بعد تو میں نے سال بھر اس کے گھنڑ اور لائیں کھا میں۔“

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھریں اور آواز بھرا مٹی تو حاحرہ نے اس کے بازو پر رکھ کر جیسے اسے تسلی دی۔ اور چند گھنٹوں بعد اس نے آنکھیں پونچھ کر حاحرہ کی طرف دیکھا۔

”کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب وہ مجھے نہ مارتا ہو۔ میرا پورا جسم نیلیوں نل ہو گیا تھا۔ دادی اسے منع کرتیں کو سننے دیتیں لیکن وہ دادی کی ایک نہیں سنتا تھا۔ اس کا ایک ہی مطالبہ تھا زمین کے کاغذ اس کے حوالے کروں اور بینک میں موجود ساری رقم بھی اسے دے دوں۔ سراج بابا نے مجھے منع کیا تھا کہ ہرگز ایسا نہ کرنا اور نہ ہی کسی سادے اہلام اور کاغذ پر دستخط کرنا۔ وہ تم سے مختار نامہ لے کر سب زمین فروخت کر کے پیسہ عیاشی میں اڑا دے گا۔ زمین کے کاغذ وغیرہ سب ان کے ہی پاس تھے۔ وہ میری شادی کی خبر سن کر آئے تھے جب اکبر خان مجھے گھر چھوڑ کر لاہور گیا تھا۔ وہ بہت غناور ناراض تھے۔

”میں تو ملتان گیا ہوا تھا بیٹے کے پاس۔ کل ہی آیا تو میری بہو نے بتایا کہ نصیر تاپا کی پوتی کی شادی اکبر خان سے ہو گئی ہے۔ یہ تم نے کیا کیا ناصرہ، کتنا

سے کچھ نہیں کہا۔“

”نجب..... وہ چھٹی پر آیا تو بہت لڑا ابا ہے۔  
اماں سے بھی ناراض ہوا۔ بولا کیا میں مر گیا تھا جو  
آپ نے مجھے اطلاع نہیں بجھوائی۔ بہن بھی میری اور  
یہ چند کمٹوں کے قاصدے پر تھا میں لیکن ابا کو ڈر تھا کہ  
میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔“  
”ہاں ڈر تھا مجھے.....“ ابا نے اعتراف کر لیا  
تھا۔ میں زبان دے چکا تھا اور شریف لوگ زبان  
سے نہیں پھرتے۔“

”وہ آپ کی بیٹی نہیں تھی۔ اس لیے آپ نے  
یہ ظلم کیا۔ دراصل آپ نے بھی اسے اپنی بیٹی سمجھا ہی  
تھیں۔ ہمیشہ اماں کی ہی بیٹی سمجھا۔“ وہ روہانسا ہو رہا  
تھا۔

”بہت ظلم کیا، ابا آپ نے بہت ظلم.....“  
ابا اس کی بات کا جواب دیے بغیر دکان پر چلے  
گئے۔ تو اس نے مجھ سے شکوہ کیا۔  
”میں نے تم سے کہا تھا کہ انکار کر دینا۔“  
”میں کیسے انکار کر لی جو۔“

میں ایک طرف سر جھکائے بیٹھی تھی۔ مجھے  
یہاں آئے آج پانچواں دن تھا اور میری شادی  
ہوئے نو دن ہو گئے تھے۔  
”کیوں کیوں انکار نہیں کر سکتی تھیں تم۔ میں  
نے تمہیں بتایا تھا وہ تمہارے قابل نہیں ہے ذرا۔“  
وہ مجھ سے چھوٹا تھا لیکن وہ ہمیشہ میرا نام لے کر  
ہی بلاتا تھا۔

”میری گردن ابا کے احسانوں کے بوجھ سے  
جھکی ہوئی تھی جو۔ میں ان کی بیٹی نہیں تھی لیکن انہوں  
نے.....“

”کیسے احسان.....؟“ اماں نے تڑپ کر  
میری بات کاٹی تھی۔

کوئی احسان نہیں کیا انہوں نے تم پر۔ اپنی  
ذاتی کمائی سے بھی ایک روپے کی چیز تک لے کر نہیں  
دی تھیں۔ تمہارے تمام اخراجات میں اپنی زمین کی  
آمدنی سے کرتی تھی۔ تمہارے کپڑے، تمہارے

مجھے اب بھرا کرنا تھا اور میں نے بھرا کرنے کی کوشش  
بھی کی۔ بس بابا سراج کے کہنے پر بھارتا نے پر دستخط  
نہ کیے کہ میں بھی مجھ کی مٹی کا بھارتا نامہ ملے ہی وہ  
سب فروخت کر دے گا اور پھر شاید مجھے پہلی بیوی کی  
طرح حار دے گا، جیسا کہ لوگ کہتے تھے۔ وہ مجھے مار  
مار کر ادھ موا کر دیتا تھا۔ دادی بے چاری مجھے بجاتے  
ہوئے غڑحال ہو جاتی تھیں۔ یہ کیسا نصیب تھا میرا  
حاجرہ آپ۔“

اس نے آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔  
”میں نے تو جی بھی کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا  
پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ میں نے تو ابھی  
بنی کی طرح ابا کی بات مانی تھی آپ۔ کیا یہ میری غلطی  
تھی۔ ابا اور اماں آئے تھے ایک دو بار ملے۔ وہ سارا  
وقت پاس ہی بیٹھا رہا۔ میں اماں سے کچھ بھی نہ کہہ  
پائی تھی۔ حالانکہ دل چاہتا تھا ان کے گلے لگ کر  
روؤں انہیں اپنا زخم و زخم وجود دکھاؤں اور کہوں مجھے  
یہاں سے لے چلیں۔ وہ مجھے اب میکے میں نہیں  
جانے دیتا تھا۔ ابا اکیلے آتے تو مجھے ہی سمجھاتے۔  
”وہ تمہارا شوہر ہے جو کہتا ہے اس کی بات  
مان لو۔ وہی اب تمہارا وارث ہے۔“

”اور ابا کے جاتے ہی دادی سمجھاتیں۔“  
”تمہارا باپ تمہارا ہمدرد نہیں ہے۔ غلط  
مشورہ دیتا ہے اس نے پہلی بیوی سے بھی سب کچھ  
لے کر اسے مار مار کر دوسرے جہان پہنچا دیا تھا۔“

”اور میں جو سوچتی تھی کہ سب کچھ اس کے  
حوالے کر دوں اور جان چھڑاؤں۔ ڈر جاتی تھی۔  
مجھے مرنے سے ڈر لگتا تھا، میں جینا چاہتی تھی۔ لیکن  
یہ کیسی زندگی تھی جو موت سے بدتر تھی۔“ اس کی آواز  
بھرا گئی تھی آنکھیں پھر جھلک پڑی تھیں۔

حاجرہ نے ایک بازو اس کے گرد جامل کر کے  
اسے اپنے ساتھ لگایا اور ہولے ہولے تھکے لگیں۔  
کچھ دیر بعد وہ ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھتے  
ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تو حاجرہ نے پوچھا۔  
”اور نجیب تمہارا بھائی۔ کیا اس نے تمہارے ابا



اسکول کے اخراجات سب۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں بھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس ہو کہ تمہارا باپ سوٹلا ہے۔ اور یہ دکان بھی میری اماں ابا کا گھر بیچ کر بنائی گئی تھی۔ پھر جی خود سے وہ بھی ایک روپے کی چیز تک تمہارے لیے نہیں لائے۔“

”کاش! یہ سب مجھے پہلے سے پتا ہوتا تو میں کبھی بھی.....“

”اب بھی اگر تم اس کے ساتھ نہ رہنا چاہو تو طلاق لے لو زارا میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”نجیب نہیں چاہتا تھا کہ میں ایسے شخص کے ساتھ اپنی زندگی برباد کروں۔“

”نہیں..... نہیں نجو طلاق یا فہ لڑکی کو معاشرہ اچھا نہیں سمجھتا۔“

اماں نے بے اختیار کہا تھا اور خود میں بھی نہیں جانتی تھی کہ آگے زندگی میرے لیے جہنم ہو گی۔ تین دن ہی تو جب گزارے تھے میں نے اور اندر نہیں امید کی تھی کہ شاید میری خدمت اور محنت اسے بدل دے۔ لیکن نہیں جانتی تھی کہ اس نے تو شادی ہی میری زمین کے لیے کی ہے۔

”نجیب دوسرے دن واپس چلا گیا تھا۔ اس نے اب اسے کوئی بات نہیں کی تھی وہ ان سے ناراض تھا۔ اور اس کے جانے کے بعد اباسل میں مجھے اکساتے رہے کہ میں روپیہ، پیسہ زمین سب کچھ اکبر خان کو دے دوں۔ اباجتوں نے بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ اب اکبر خان کے آنے تک ہر روز دکان پر جانے سے پہلے میرے کمرے میں آتے اور محضرت کرتے۔“

”ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہوئی، میں نے اکبر کے متعلق تحقیق نہیں کی۔ لیکن اب تمہارے لیے یہ ہی بہتر ہے کہ تم اس کی بات مان لو۔ ورنہ وہ بڑا ”کاشی مت“ والا ہے۔ اور اگر اس نے تمہیں کچھ کہا تو نجیب نہیں چھوڑے والا اسے۔ خواہ خواہ غصے میں اس نے کچھ لٹا سیدھا کر دیا اس نے تو مطلب مارا دیا تو پھانسی چڑھ جائے گا۔ نجیب کی خاطر ہی اس کی بات مان لو۔“

ابا جانتے تھے کہ نجیب میں میری جان ہے اور میں نے اسے بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ جب بھی گھر پہنچتا تو آتا تو دو تین کھٹے کے لیے مجھ سے بھی ملنے آتا۔ میری حالت دیکھ کر کہتا۔ بار بار مجھ سے پوچھتا۔

”اکبر خان تمہیں مارتا بیٹا تو نہیں ہے۔ یہاں لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ پہلی بیوی کو بہت مارتا تھا۔“

میں انکار کر دیتی۔ میں جانتی تھی وہ جذباتی تھا۔ جذبات میں کچھ لٹا سیدھا کر دیتا۔

”اماں تمہیں بہت یاد کرنی ہیں روتی رہتی ہیں۔ تم گھر کیوں نہیں جاتیں۔ مجھے بتاؤ اکبر بیٹا کرتا ہے تو اسے سیدھا کروں۔“

”نہیں بس وہ میں دادی کی وجہ سے نہیں جاتی اور پھر میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔“

اور وہ تشویش سے مجھے دیکھتا ہوا واپس چلا جاتا۔

لیکن اس روز وہ اچانک آ گیا۔ اکبر نے ملتی ہوئی لکڑی چولہے سے کچھ کر میرے بازو پر ماری تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مارتا کھلے دروازے سے اندر آتے ہوئے نجیب نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”بس۔“ اس کی دھاڑ پورے صحن میں گونجی تھی۔

”تمہیں جرات کیسے ہوئی میری بہن کو مارنے کی۔ زعمہ نہیں چھوڑوں گا تمہیں آج۔“

دادی رونے لگیں جنہیں کرنے لگیں تو نجیب نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ بکنا جھکا گھر سے باہر نکل گیا تو نجیب نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ میرے بازو کی کھال بڑی طرح جل گئی تھی۔ تکلیف کی شدت سے میرے آنسو نکل رہے تھے۔

”زارا نے آستین پیچھے کر کے اپنا بازو آگے کیا یہ ابھی تک نشان ہے۔“

حاجرہ تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اس روز نجیب مجھے وہاں سے لے کر سیدھا

پڑتا ہے جو مجھے کون سی شادی کرنی ہے۔“  
 ”کیوں نہیں کرنی شادی۔ تمہاری پوری زندگی  
 پڑی ہے۔ میں خود کروں گا تمہاری شادی۔ کتنا  
 اچھا انسان تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا لیکن ابانے  
 .....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”میں تمہا نہیں ہوں میرا بیٹا ہے نا وہ بنے گا  
 میرا سہارا۔“

”پر فیصل اکبر خان اور راشد منیر نہیں ہوتا زارا۔  
 اچھے لوگ بھی ہیں دنیا میں..... اور یہ تو اللہ ہی جانتا  
 ہے کہ اس نے تمہارے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ کیا  
 پتا کوئی بہت ہی اچھا صفر تمہارا نصیب بنے۔“

وہ مجھے تسلی دے کر اور اماں کو یہ بتا کر چلا گیا کہ  
 وہ اکبر خان سے بات کرنے اور میرا سامان لینے  
 گاؤں جا رہا ہے۔ اماں سارا دن جا نماز سنبالے  
 دعائیں مانگتی رہیں۔ اور اکبر خان نے یہ کہہ کر مجھے  
 طلاق دے دی تھی۔

”اسے کوئی شوق نہیں ہے دودھ نہ دینے والی  
 بھینس کو گھبراہٹ دینے کی۔ یہ تو میرے باپ نے  
 زمین کا لالچ دے کر مجھے شادی کے لیے کہا تھا کہ  
 اسد اللہ کی بیٹی سے تیری شادی کروادیتا ہوں۔ آدمی  
 زمین تیری آدمی میری۔ چیک کا پیسہ بھی آدھا  
 آدھا۔“

جب نجیب اماں کو بتا رہا تھا تو میں نے سنا تھا۔  
 تو ابانے اس لیے میری شادی اکبر سے کی تھی۔ اباجھے  
 سے کہتے تو میں ویسے ہی سب کچھ ان کے نام کر دیتی  
 اور نجیب بھی اماں سے یہ ہی کہہ رہا تھا۔ ”بازار اسے  
 مانگتے تو وہ خود ہی اباکو سب دے دیتی۔ وہ ایسی ہی  
 ہے بڑے دل والی۔ کیا کوئی اس طرح بھی کرتا ہے  
 ہمارے پاس کس چیز کی کمی تھی۔“

وہ جیسے روہنے والا ہو رہا تھا۔ اور اماں جیسے  
 صدمے میں بیٹھی تھیں۔ بڑی دیر بعد اماں نے کہا  
 تھا۔

”تمہارے باپ نے ساری زندگی زارا کو اپنی  
 بیٹی نہیں سمجھا۔ وہ اس سے نفرت کرتے رہے میں ہی

ہسپتال گیا تھا۔ جہاں مجھے داخل کر لیا گیا تھا۔ اور تین  
 دن بعد میرا بیٹا پیدا ہوا۔ میری حالت ٹھیک نہیں تھی۔  
 پتا نہیں میں کیسے بچ گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو اماں  
 میرے بیڈ کے پاس بیٹھی تھیں اور ان کے آنسو  
 میرے ہاتھ پر گرتے تھے جو انہوں نے تمام رکھا  
 تھا۔ میں تو بہت نازک تھی بہت نزل۔ پتا نہیں میں  
 نے ایک سال اتنی تکلیف کیوں اور کیسے برداشت  
 کی۔ مجھے زمین اور پیسے سے بھی کوئی ایسی دلچسپی نہ  
 تھی۔ لیکن سراج بابا کہتے تھے کہ اگر تم نے اکبر کو سب  
 کچھ دے دیا تو تمہارے دادا اور ابابا کی روحیں اس  
 جہاں میں بھی ٹھپ نہیں گی۔

بہت تکلیف برداشت کر لی تھی میں نے لیکن  
 اب نہیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب واپس نہیں  
 جاؤں گی اور نجیب اس نے بھی ہسپتال سے گھر واپس  
 آتے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا۔

بس اب کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ اب جو کرنا ہے  
 وہ اب میں کروں گا۔ اور کوئی زارا کو مجبور نہیں کرے گا  
 کہ وہ واپس اپنی سسرال جائے۔“

اور اس نے اکبر سے طلاق کا مطالبہ کر دیا اور  
 پھر اس کے انکار پر خلع کا کیس کر دیا۔ اور یہ کوئی  
 آسان نہیں تھا آپ۔ پہلی دو ہیشیوں پر ہی میری ہمت  
 جواب دے گئی۔ ویسل نے ایسے ایسے سوال کیے اور  
 ایسی ایسی باتیں کیں کہ میرا دل چاہتا تھا کہ زمین  
 پھٹ جائے اور میں اس میں دفن جاؤں۔ میں نے  
 نجیب سے کہا۔

”خدا کے لیے جو مجھے خلق نہیں چاہیے۔ بھلے  
 وہ مجھے ساری زندگی طلاق نہ دے۔ لیکن یہ بے عزتی  
 مجھ سے برداشت نہیں ہوئی۔ بس ختم کر دو یہ کیس۔“  
 اور اس نے میرے آنسو پونچھے تھے۔

”ٹھیک ہے زارا ہم پریشان مت ہو۔ میں  
 کروں گا کچھ نہ کچھ۔ میں اسے مجبور کروں گا کہ وہ  
 تمہیں طلاق دے دے چاہے مجھے کچھ بھی کرنا  
 پڑے۔“

”وہ طلاق دے یا نہ دے اس سے کیا فرق

نہیں جان سکی۔ یہ صرف لالچ نہیں تھا نجو۔“ اماں  
اب رورہی تھیں۔

”ورنہ ذرا کے دادا دادی کے گھر کے پیسے بھی  
انہوں نے ہی رکھ لیے تھے کہ دکان میں مال ڈالنا  
ہے۔ جب اس کی شادی ہوگی تو۔۔۔۔۔“

اور میں نے باقی بات نہیں سنی تھی کہ داصف  
میرا بیٹا رورہا تھا میں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس  
رات نجیب اور اماں بہت سچ کلائی ہوئی تھیں۔ نجیب  
بہت خراب موڈ کے ساتھ واپس گیا لیکن جانے سے  
پہلے اس نے مجھے بہت کئی دہائی کی اور سمجھا تھا۔

”تمہیں اب سب کچھ بھول کر نئی زندگی شروع  
کرنی ہے۔ داصف تھوڑا سا بڑا ہو جائے تو تم  
یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیتا۔ اماں اسے سنبھال  
لیں گی۔ کوئی ملازمہ بھی رکھ لیں گے۔ تمہیں کوئی مالی  
پرالیم تو نہیں ہوگا پھر بھی میں ہوں کوئی بھی مشکل  
ہوئی سنبھال لوں گا۔ تمہیں بس اب رونا نہیں ہے  
پریشان نہیں ہونا۔“

وہ مجھ سے چھوٹا تھا لیکن مجھے بڑوں کی طرح  
سمجھا تھا تھا۔ سراج بابا اب بوڑھے ہو گئے تھے اور  
چاہے تھے کہ زمین وغیرہ کا سب کام اب نجیب خود  
سنبھالے۔ کسے ٹھیکے پر دینی ہے۔ کیا کرنا ہے لیکن  
ظاہر ہے یہ کام وہ نہیں کر سکتا تھا کہ کسی بھی تو تین تین  
میسے وہ نہیں آ پاتا تھا سو اماں اور اس کے مشورے  
سے سراج بابا کی مدد سے زمین اچھی قیمت پر فروخت  
کر دی گئی تھی اور رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کروا  
دی گئی تھی۔ اسی لیے نجیب نے مالی پرالیم نہ ہونے کا  
کہا تھا۔

”تم اور داصف میری ذمہ داری ہو اب اور  
تمہاری رقم داصف کے کام آئے گی اس کی تعلیم  
وغیرہ کے لیے اگر بھی ضرورت پڑے گی تو۔“ جاتے  
جاتے اس نے پھر مجھے داصی کے متعلق فکر نہ کرنے  
کی تاکید کی تھی۔ ”تم سمجھو داصی تمہارا نہیں میرا بیٹا  
ہے۔“

”کہیں اکبر خان اسے چھین کر نہ لے

جائے۔“ اسے ابانے بتا دیا تھا داصف کا۔“ میں  
خوف زدہ تھی۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بھلا کیوں چھین  
کر لے جائے گا۔ اور اگر وہ عدالت گیا تب بھی  
اسنے چھوٹے بچے کو عدالت ہاں کے ہی حوالے کر لی  
ہے۔“

میں مطمئن ہو گئی تھی لیکن یہ اطمینان صرف چند  
دنوں کا تھا۔ اکبر نے تو میرا بیٹا نہیں چھینا تھا لیکن ابانے  
خود ایک روز چپکے سے اسے اٹھا کر اکبر کے حوالے کر  
آئے اور انہیں اس پر ذرا سی شرمندگی بھی نہ تھی۔  
اماں کو بخار تھا اور میں داصف کو سلا کر اماں کو دیکھنے  
آئی تھی اور انہوں نے میرے کمرے سے اسے اٹھا  
لیا۔ مجھے تو جیسے سکتے ہو گیا تھا اور اماں جی جی کر رو  
رہی تھیں۔ وہ گھر آئے تو اماں کو ڈانٹنے لگے۔

”اتنا دوا دلا کیوں کر رہی ہو۔ مر نہیں گیا تمہارا  
نواسہ۔ اس کا باپ لے گیا ہے۔ اسے دیکھنے آ یا تھا،  
میں نے کہا لے جاؤ۔ پہلے اسماء اللہ کی بیٹی کو پالتا رہا  
اب اس کے نواسے کو ہرگز نہیں پالوں گا۔“

تب اماں کا اور ابانے کا بہت جھگڑا ہوا۔ مجھے تو لگتا  
تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ وہ تو صرف چھ ماہ کا  
تھا۔ جیسے میرے پیٹ پر رہے گا۔ میں راتوں کو اٹھ جاتی  
اور چھین مار مار کر روئی۔ ہر روز ابانے کی تھیں کرنی ہاتھ  
جوڑتی کہ انہوں نے جو کچھ لیتا ہے لے لیں بس  
مجھے میرا بیٹا ملا دیں۔ وہ میرے رونے اور تھیں کرنے  
پر رکھوڑتے ہوئے اور مسکراتے رہتے۔

پھر نجیب آ گیا۔ اماں نے اسے خطا سمجھوایا تھا۔  
آتے ہی ابانے کے ساتھ اس کی بہت لڑائی ہوئی۔ اس  
نے تھانے میں رپورٹ درج کروائی۔ دو تین بار  
پولیس نے اکبر خان کے گھر چھاپا مارا۔ نجیب خود  
ساتھ گیا تھا۔ گھر میں صرف دادی تھیں۔ انہوں بتایا  
کہ وہ بچے کو لے کر گھر نہیں آیا۔ وہ بیمار ہیں اس لیے  
ان کے پیچھے نہیں لینے آئے ہوئے تھے۔ میرا بیٹا  
بہت خوب صورت تھا بالکل اپنے ماموں نجیب کی  
طرح۔ میں نے تو اسے جی بھر کر دیکھا بھی نہ تھا اور

وہ رونے لگی حاجرہ بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس ماں کو کیا تسلی دیتی جس کا بیٹا اتنی چھوٹی سی عمر میں اس سے چھن گیا تھا۔ کوئی بھی لفظ اس دکھ کا مداوا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ بس ہولے ہولے اس کا بازو جھٹکتی رہیں۔ کچھ دیر رونے کے بعد وہ خود ہی تسکین لگتی تھی۔

”غیب بہت کوشش کر رہا تھا لیکن اکبر کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس کے دوستوں اور جاننے والوں کے گھروں پر بھی چھاپے مارے گئے۔ لیکن وہ پتا نہیں کہاں چھاپا ہوا تھا۔ غیب کو جب بھی موقع ملتا گھر آتا مجھے تسلی دیتا مگر کی تسکین کرتا لیکن مجھے مبر نہیں آتا تھا لیاں اور اب اس اب اکثر جھگڑا ہونے لگا تھا۔ اب جو پہلے بھی مجھے مخاطب نہیں کرتے تھے میری طرف دیکھتے نہ تھے اب آتے جاتے باتیں سناتے اتنی نفرت سے مجھ دیکھتے کہ مجھے لگتا کہ یہ نفرت مجھے جلا کر رکھ کر دے گی۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے مجھے آوازیں دیتے۔ جوتے پالش کر دو۔ کپڑے استری کرو۔ پانی لے آؤ۔ سات سات بار استری شدہ جوڑا گول مول کر کے الماری میں پیٹیک دیتے۔ مجھے اتنا تنگ کرتے کہ میرا دل چاہتا کہ اس گھر سے کہیں چلی جاؤں یا پھر چھت سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی ختم کر لوں۔ اب تو کبھی کبھی مجھ پر ہاتھ بھی اٹھا دیتے تھے۔

”نفرت ہے مجھے تم سے اور تمہارے باپ سے بھی۔“

کئی بار انہوں نے میرے منہ پر تھوک دیا۔ انہیں جیسے اماں کی بھی پروا نہیں تھی۔ اب میں اماں کی گود میں سر رکھ کر روئی۔

”اماں! اجو کے ابا تو سنڈریلا کی اماں سے بھی زیادہ ظالم ہیں نا اور جن کے ابا سوتیلے ہوں ان کے لیے تو کبھی کوئی مہربان پری نہیں آتی۔“

اماں میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے

ہوئے چپکے چپکے آنسو بہا تھیں۔ اور میں سوچتی کہ یا اللہ میرے لیے کبھی کسی مہربان پری کو بھیج دے جو مجھے اپنی جادو کی ہنسی میں بٹھا کر میرے بیٹے کے پاس لے جائے اور بس پھر میں اپنے بیٹے کو لے کر کہیں دور چلی جاؤں۔ جہاں سے ابا میرے بیٹے کو چھپا کر اکبر خان کو نہ دے سکیں۔ زندگی کی لڑکیوں سے گھبرا کر میں ٹیل کی واڈیوں میں پناہ دیتی تھی۔ ان دنوں زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی۔

اس نے بھی تسلی کی جو بھل پکلیں اٹھا تھیں۔

”ابا! کاروبار، اماں اور ابا کے جھگڑے مجھے اپنا آپ مجرم لگنے لگتا تھا۔ پہلے تو کبھی ان میں جھگڑا نہیں ہوا تھا اور اب میری وجہ سے اماں کی ان سے لڑائی ہوتی۔ اماں چاہتی تھیں کہ وہ وہی کو لے آئیں۔ انہیں ضرور پتا ہوگا کہ اکبر کہاں چھپا ہوا ہے۔ وہ مگر جاتے اور پھر تلخ کلامی جھگڑے میں بدل جاتی۔ ابا ادھر ادھر پڑی چیزوں کو کھو کر میں مار کر مجھے اور میرے ابا کو کالیاں دے کر خسر نکالتے اور اماں رو کر۔

”خدا کے لیے جو مجھے کہیں لے جاؤ وہ نہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ غیب دو دن کی چھٹی پر آیا تو میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”مجھے سراج بابا کے گھر چھوڑ آؤ یا کہیں کسی ہوٹل میں میں یہاں نہیں رہوں گی تو اماں اب اس جھگڑا بھی نہیں ہوگا۔“

غیب نے کہا۔ ”ٹھیک ہے واہس جا کر مجھے اپنی دوست کی بہن کے کاغذات جمع کروانے ہیں ایجوکیشن کالج میں ایڈمیشن کے لیے تمہارے بھی کروا دوں گا۔ ایک سال کا کورس ہے نیچر ٹریننگ کا۔ بی ایڈ کر لو گی تو تمہارے پاس ایک ڈگری ہوگی جب بھی ضرورت پڑی جاوے گی تو میرا دینی الحال دینی طور پر اس ماحول سے بھی نکل جاؤ گی۔ تم سامنے نہ ہو میں تو شاید اماں اب اس اتنے جھگڑے میں نہ ہوں۔“

ان دنوں غیب لاہور میں تھا۔ یوں میں کلاسز شروع ہونے پر غیب کے ساتھ لاہور چلی گئی۔ میرا ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ میرے کمرے کی لڑکیاں اچھی تھیں دینی طور پر میرا دل بھلا رہتا۔ غیب ہر ویک

ایڈ پر مجھے ملے آتا تھا اور امید دلا جاتا کہ بہت جلد  
 واپسی میرے پاس ہوگا۔ بس میں اپنی پڑھائی پر  
 دھیان دوں۔ میں دن بھر تو خود کو مصروف رکھتی تھی  
 لیکن رات کو جب بیڈ پر لیٹی تو واپسی اور اماں بہت یاد  
 آتے تھے۔ نیچ بھی کسی چٹھی پر کمر بھی چلا جاتا  
 تھا۔ جس روز میں آخری پیپر دے کر فارغ ہوئی تو وہ  
 مجھے لینے آیا تھا اور بہت خوش تھا۔

”زارو! اب ان شاء اللہ دس پندرہ دن تک  
 تمہارا بیٹا تمہارے پاس ہوگا۔ ایک جاننے والے  
 کے ذریعے پتا چلا تھا کہ اس نے واپسی کو یہاں رکھا  
 ہوا ہے کسی گھوڑے کے پاس پیسہ دیا وہاں گئے تو وہ جاچکا  
 تھا وہاں سے۔ بہر حال ایک شخص کے ذریعے بات  
 چل رہی ہے اس سے، کچھ دے دلا کر واپسی کو لے  
 لیں گے۔ وہ تقریباً راضی مند ہے۔ بس رقم اپنی مرضی  
 کی لینا چاہتا ہے۔ میں نے بھی اس درمیانے شخص کو  
 کہہ دیا ہے کہ جو مانگا ہے دے دو بس کام نکلے ہو۔  
 اس نام لکھا لینا کہ اس کا پھر کوئی تعلق نہیں ہوگا واپسی  
 سے۔“

میں جو امید کھو بیٹھی تھی بیٹے کے ملنے کی جیسے  
 پھر سے جی اٹھی تھی۔

”اور میں نے آگے کے لیے بھی سوچ لیا  
 ہے۔ واپسی آجائے تو پھر میں شادی کر لوں  
 گا۔ جہاں بھی پسٹنگ ہوئی۔ مگر مل جائے گا تو تم  
 اور واپسی بھی ہمارے ساتھ رہنا کہ اباب تمہیں اور  
 واپسی کو بالکل برداشت نہیں کریں گے۔“

وہ میرا بھائی..... میرا دوست ہمرد..... وہ کتنا  
 اچھا تھا آبا، کہ اس نے آگے تک کی پلاننگ کر لی  
 تھی۔ میرے لیے..... میری خاطر وہ شادی کے لیے  
 بھی تیار ہو گیا۔ حالانکہ پہلے وہ کہتا تھا کہ اسے ابھی  
 شادی نہیں کرنی کہ ابھی کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جو اس  
 کے دل کے تاروں کو چھیڑ دے۔ وہ اپنی پسند کی  
 شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اب وہ کہہ رہا تھا اب اس  
 کہنا میرے لیے فوراً کوئی لڑکی ڈھونڈیں۔“  
 ”اور وہ اس کا اتنا اچھا بھائی کہاں تھا وہ ان

نا۔ اللہ جانتا تھا نا!.....“  
 اب وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور چارہ اسے  
 گلے سے لگائے ہوئے ہوئے ہولے ہولے تھپک رہی تھی۔ پھر وہ  
 غڑھال ہی ہو گئی تو چارہ نے اسے بستر پر لٹا کر اپنے  
 دوپٹے کے پلے سے اس کا چہرہ پونچھا۔  
 ”بس اب نہیں رونا بالکل نہیں۔ اللہ کی رضا پر  
 راضی ہونا پڑتا ہے زارا۔ اللہ اپنی مصلحتیں خود جانتا  
 ہے۔ ہم بندے کیا جانتیں۔“  
 ”جو کے چلے جانے میں بھلا کیا مصلحت تھی  
 آبا؟“

اس نے شاکی نظروں سے چارہ کی طرف  
 دیکھا اور آنکھیں سوندھ لیں ایک دم تھا تھی سی طاری  
 ہو گئی تھی۔ چارہ نے محسوس کیا اور اسے گرم دودھ لاکر  
 زبردستی پلا دیا۔  
 ”بس اب بالکل نہیں سوچنا۔ کچھ بھی نہیں۔  
 اور سونے کی کوشش کرتا۔“

روح نے مجھ سے بدلہ لے لیا۔ اس نے اتنے سالوں بعد اکرمیرے بیٹے کو کھائی میں دھکا دے دیا۔ مار دیا اسے۔ ”نامرہ حیران سی کھڑی تھیں۔  
”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“  
”یہ..... کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسد اللہ کو مارا تھا، اس نے میرے بیٹے کو مار ڈالا۔“  
”لیکن کیوں..... کیوں مارا آپ نے اسد اللہ کو؟“ نامرہ کے لہجوں سے نکلا تھا۔

”وہ ہمیشہ ہر وہ کام جو میں کرنا چاہتا تھا مجھ سے پہلے کر کے سب کی تعریفیں وصول کر لیتا تھا۔ مجھے نامرہ اچھی لگتی تھی میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن مجھ سے بڑا ایک بھائی اور ایک بہن بھی اور وہ اکلوتا تھا۔ اس کے ماں باپ نے مجھ سے پہلے ہی نامرہ کا رشتہ مانگ لیا۔ اور نامرہ اس کی بیوی بن کر ہمارے گھر آ گئی۔“  
وہ نامرہ کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ سامنے دیکھ رہے تھے۔

”پھر میں نے اسے مار ڈالا۔ ایک شام میں جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ مجھے پتا تھا کہ بس وہ آنے والا ہوگا۔ میں نے راستے میں ایک بڑا پتھر رکھ دیا تھا۔ وہ سائیکل کھڑی کر کے پتھر پٹانے لگا تو میں نے اسے دھکا دے دیا۔ نیچے کھائی میں گرے تو وہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا کہ میرے چہرے پر وہ چادر ہٹ گئی تھی جس سے میں نے منہ چھپایا ہوا تھا تو بس پھر اب اس نے بدلہ لے لیا۔ اتنا بھی خیال نہ کیا کہ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔“ وہ پھر رونے لگے تھے۔

”اور آپ نے..... آپ نے خیال کیا تھا۔ آپ نے سوچا تھا کہ وہ آپ کے چچا کا اکلوتا بیٹا ہے اور وہیں اس طرح آ کر بدلہ نہیں لیں۔ یہ مکافات عمل ہے۔“

نامرہ روتے ہوئے انہیں یونی مین میں چھوڑ کر زارا کے کمرے میں آ گئی تھیں۔ اس رات وہ دونوں جاگتی رہیں اس انکشاف نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور باہر راشد منیر وقفے وقفے سے بلند آواز سے

حاجروں نے جاتے جاتے اسے تکیہ کی تھی لیکن آج کتنے دنوں بعد زخموں کے ٹائٹے کل گئے تھے۔ ایک ایک بات یاد آ کر آنکھیں بھگور رہی تھیں۔ جو کے جانے کے بعد زندگی اور بھی مشکل ہو گئی تھی۔ واصف کے ملنے کی امید باقی رہی تھی نہ زندگی میں حریف کسی اچھی بات کی..... وہ آنکھیں موندے عجیب کے بعد گزرنے والے ہر لمحے کو سوچتی چلی گئی اور تکیہ بھینکتا رہا۔

عجیب مر گیا تھا اور اس کشادہ گھر میں جیسے سناٹے اتر آئے تھے۔ انہیں لگتا تھا اس کے گھر کے باقی تینوں نفوس کے اندر بھی زندگی مر گئی تھی۔ دکھ تینوں کا سا نکھتا تھا۔ تینوں کو ہی وہ بے حد عزیز اور پیارا تھا۔ تینوں سے ہی یہ دکھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ نامرہ اور زارا دونوں میں تھی بار ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتیں۔ راتوں کو نمیک سے نیند نہ آتی۔ سوتے سوتے بے چین ہو کر اٹھ جاتیں اور راشد منیر ان پہلے تو یقین ہی نہیں آیا تھا کہ انہیں کالا ڈالا اکلوتا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ ایک عاشق باپ تھا اپنے بیٹے سے جنون کی حد تک محبت کرتے تھے۔ اور یہ محبت انہیں یقین نہیں کرنے دیتی تھی کہ عجیب اب نہیں رہا۔ اور جب یقین آیا تو وہ دیواروں سے سرخ شیخ کر روتے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر چھین مار مار کر روتے عجیب کو آواز ہی دیتے ہاتھ جوڑ کر کہتے۔

”مجھ سے ناراض مت ہو۔ دیکھو بھلا کوئی اس طرح بھی ناراض ہوتا ہے۔“ دیواروں سے سرخ شیخ کر خود کو زخمی کر لیتے۔ نامرہ اور زارا بمشکل انہیں سنبھالتیں۔

”وہ ہی نہیں رہا تو میں اب جی کر کیا کروں گا؟“ وہ دھاڑیں مار مار کر روتا۔  
ایک روز جب وہ انہیں صحن سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں وہ چلانے لگے۔

”اس نے مارا ہے میرے بیٹے کو، اسد اللہ نے۔“ انہوں نے ہاتھ نامرہ سے چھڑا لیے تھے۔  
”میں نے اسے کھائی میں دھکا دیا تھا اس کی

رونے لگتے۔ کبھی اونچی آواز میں اسد اللہ کو برا بھلا کہنے لگتے۔ روز بروز ان کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی چھریں اٹھا اٹھا کر جھکتے کبھی اسد اللہ کو مخاطب کر کے معافی مانگتے کبھی اسے گالیاں دینے لگتے۔ کبھی ہوا میں ہاتھ ملا کر خیالی ہولوں سے لڑتے چھری اٹھا کر سارے کمن میں بھاتے پھرتے جیسے کسی کے پیچھے بھاگ رہے ہوں مارنے کے لیے۔

زارا کو ان پر غصہ بھی آتا ترس بھی۔ وہ اس کے باپ قائل تھے۔ انہوں نے زارا کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا اکبر خان سے بچا کر۔ لیکن ان کا جوان بیٹا دنیا سے چلا گیا تھا۔ سو وہ قائل رحم تھے۔

شروع شروع میں تو محلے والوں نے ہمدردی کی مجروحہ بیزار ہو گئے اور ناصرہ کو مشورہ دینے لگے کہ انہیں کسی دماغی امراض کے اسپتال میں داخل کروادو۔ راتوں کو ان کا چچتا چلانا ان کی نیند خراب کرتا ہے۔ شمس الحق ناصرہ کے خالہ زاد بھائی تھے نجیب کی وفات پر آئے تھے۔ ان کا گاہوں میں چار گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ناصرہ نے خط لکھ کر انہیں بلوایا۔ ان کے سوا اور کوئی اپنا نہ تھا۔ اور وہ چاہتی تھیں کہ راشد منیر کا علاج ہو جائے لیکن وہ اکیلی عورت کیا کرتیں، کہاں اور کسے راشد کو لے کر جاتیں۔ انہوں نے جو کیا تھا وہ ان کا محل تھا اور وہ سزا بھگت رہے تھے۔ دینی اذیت سے انہیں ہر لمحہ پریشان رکھتی تھی لیکن وہ ان کے شوہر تھے۔ ان دو اکیلی عورتوں کا واحد سہارا مرد۔

شمس الحق ان کا خط ملتے ہی آگئے لیکن ان کے آنے سے چند گھنٹے پہلے راشد منیر جانے کب گھر سے باہر نکل گئے۔ ارد گرد سے بے نیاز وہ کسی خیالی شخص کے پیچھے چھری اٹھاے سڑک عبور کرتے ہوئے ایک تیز رفتار ٹرک کے نیچے آ کر کھلے گئے۔

شمس الحق کچھ دن رہے۔ دکان کو بھی دیکھا جسے ملازم لڑکا سنبھال رہا تھا اور ناصرہ کو مشورہ دیا کہ دکان فروخت کر دیں کہ مالک سر پر نہ ہوں تو پھر ایک

لڑکا تھا کہاں کام سنبھال سکتا ہے۔

”ناصرہ نے کہا وہ جو مناسب سمجھیں کریں کہ اب انہوں نے جو کچھ کرنا ہے کریں۔“ وہ ایک عورت جو کبھی ملاوچہ گھر سے باہر نہیں نکلیں، کیا کر سکتی ہیں۔ اور شمس الحق نے کہا تھا کہ وہ چکر لگاتے رہیں گئے اور جیسے ہی کوئی مناسب گاہک ملا دکان فروخت کر دیں گے اور ان کے گاہوں جا کر ٹھیکے دار سے بھی سب ملے کر لیں گے۔ شمس الحق دو تین ماہ بعد آ کر ان کی خیر خبر لے لیتے تھے۔

لیکن راشد منیر کے مرنے کے چار ماہ بعد ایک روز اکبر خان آ گیا اور دکان پر آ کر بیٹھ گیا کہ میں دلاوا ہوں اور اب وارث ہوں۔ ناصرہ نے بمشکل محلے کے چند معتبر لوگوں کی مدد سے اسے دکان سے اٹھایا وہ جانتے تھے کہ اس نے زارا کو طلاق دے دی تھی۔ لیکن وہ مکر گیا کہ اس نے طلاق نہیں دی۔ نجیب نے جھوٹ بولا تھا اور یہ کہ زارا میری اب بھی بیوی ہے اور میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔

اتفاق سے اس روز سرنایا بھی نجیب کا سن کر اس کی تخریت کے لیے آئے ہوئے تھے انہوں نے محلے والوں کو بتایا کہ اکبر نے ان کی موجودگی میں طلاق دی تھی تب نجیب کے اور ان کے علاوہ اس کی دادی اور ڈیرے کا ایک ملازم بھی تھا جو دودھ دینے آیا ہوا تھا۔ ہاں تحریری طور پر کچھ نہ تھا لیکن تب گاؤں اور دیہاتوں میں ایسے ہی زبان طلاقیں ہوتی تھیں۔ اس وقت تو اکبر چلا گیا لیکن پھر جیسے اس نے انہیں تنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز دو تین غنڈہ قسم کے ساتھیوں کے ساتھ آ جاتا اور ادم چاکر چلا جاتا۔ ایک دو بار رات کے وقت انہیں لگا جیسے کمن میں کوئی گودا ہو۔ ساری رات وہ دونوں جاگتی رہیں۔

”اسد اللہ کی جائیداد کا وارث میرا بیٹا ہے۔ اپنی بیٹی سے کو اپنا حصہ لے کر ساری زمین میرے بیٹے کے نام کر دے۔“

ایک روز ناصرہ کسی کام سے گھر سے باہر نکلیں تو



اس نے راستہ روک کر کہا تو محلے کے ایک بزرگ نے اسے ڈپٹ کر بھگایا۔

راشد منیر جس حالت میں بھی تھے ان کی موجودگی میں اکبر خان اس طرح نامرہ کا راستہ روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا وہ نہیں تھے تو اب وہ دھمکیاں دینے لگا تھا۔ کبھی کہتا زارا کو اٹھا کر لے جائے گا۔ کبھی کہتا مار ڈالے گا۔ شمس الحق نے سمجھایا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا لیکن وہ عورتیں تھیں ہر وقت ڈری اور سبھی رہتیں۔ تب شمس الحق دکان فروخت کر کے انہیں اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے گئے اور گھر عارضی طور پر کرائے پر دے دیا۔ شمس الحق صاحب کا گھر بہت بڑا نہیں تھا لیکن اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ وہ ایک کمرہاں بنی کو نہ دے سکتے تھے۔ یہاں زندگی پر سکون تھی۔ اکبر کو یہاں کا پتا نہیں تھا لیکن پتا چل بھی جاتا تو بھی وہ یہاں اکیلی نہ تھیں۔ شمس الحق ماموں تھے اور ان کے دو کزن مل جواں بیٹے تھے۔ اور انہوں نے نامرہ کو بہت ہلکی دی تھی۔

”پچھو! ہمارے ہوتے ہوئے کسی کی جرأت نہیں کہ وہ آپ کی بازار باہن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ گو وہ اکبر کی طرح طرف سے مطمئن تھیں لیکن نجیب کی ابدی جدائی ایک ایسا زخم تھا جو مسلسل رہتا تھا۔ سارا دن وہ حوصلہ کیے رہتی تھیں لیکن کمرے میں آتے ہی دونوں کے آنسو بہہ نکلنے لگتے۔ یہ کیا ہو گیا تھا ان کے ساتھ اچانک کیسے غم کے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑے تھے۔

شمس الحق کے انکار کے باوجود نامرہ اپنے کھانے پینے کا خرچ ہر ماہ صابرہ بھابی کو پکڑا دیتی تھیں۔ چھ سات ماہ تو بہت سکون سے گزر گئے تھے لیکن پھر زارا نے محسوس کیا کہ مامی زبان سے تو کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن ان کے رویے میں بیزاری صاف نظر آتی تھی تب اس نے شمس الحق سے کہا تھا۔

”ہم ساری زندگی تو آپ پر بوجھ بن کر نہیں رہ سکتے کل کو آپ نے بیٹوں کی شادیاں بھی کرنی ہیں تو ہمیں یہاں گاؤں میں ہی کوئی گھر خرید دیں۔“

”کیا کوئی بات ہوئی ہے بیٹا؟“ شاید وہ بھی اپنی بیوی کے رویے کو محسوس کرتے تھے۔

”نہیں ماموں، جان! ایسی کوئی بات نہیں بس اماں اور میں چاہتے ہیں کہ اپنا گھر ہو۔ اور ہمارا گھر یہاں گاؤں میں ہی ہوگا تو ہمیں آپ کا آسرا بھی رہے گا۔“

”لیکن بھائی کا گھر ہوتے نامرہ الگ گھر کیوں لے۔ میری غیرت گوارا نہیں کرنی۔ تم یہاں ہی رہو گی اور جب قاروق اور عادل کی شادی کا وقت آیا تو ان کے لیے بھی کمرے بن جائیں گے۔“

لیکن صابرہ مامی کا رویہ روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا تب اس نے شمس الحق سے کہہ کر لاہور اپنے کالج سے اپنا رزلٹ منگوا لیا اور جب اخبار میں انچرز کی آسامیاں نکلیں تو اس نے بھی درخواست دے دی۔ اسٹریو کال آئی تو وہ شمس الحق کے ساتھ جا کر اسٹریو بھی دے آئی۔ اور خوش قسمتی سے اسے جاب بھی مل گئی۔

”لیکن انجینیئر میں تم کہاں اور کیسے رہو گی، وہ بھی اکیلی۔“ شمس الحق پریشان ہوئے۔

”کیا پتا اس اسکول کا ہوٹل بھی ہو اور اگر نہ ہو تو کوئی گھر کرائے پر لے کر اماں کو ساتھ لے جاؤں گی۔“ وہ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

”ساتھ والے قصبے میں ہائی اسکول ہے لڑکیاں یہاں سے ہر روز آتی جاتی ہیں جیسے چھپچھ منٹ کا راستہ ہے میں کسی سے کہہ سن کر وہاں لکوا دیتا ہوں۔“

”شمس الحق بے حد غلط اور ہمدردی انسان تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ماں بنی وہاں اکیلی رہیں اور اکبر یا کوئی اور انہیں تنگ کرے۔

گورنمنٹ کی نوکری اتنی آسانی سے نہیں ملتی ماموں، ایک دفعہ (جوائن) Join کر لوں پھر اگر کوئی مشکل ہوئی تو ٹرانسفر کی کوشش کروں گی، نہ ہوگی تو واپس آجائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“

دیکھ پائے گی۔“ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ”اور کیا بڑا ہو کر میرا بیٹا بھی اپنے باپ کی طرح ہوگا۔ شرابی اور عیاش اتنا ہی عالم اور بے حس۔“

”نہیں..... میرے اللہ نہیں۔ میرے بیٹے کو اچھا انسان بنانا اپنے ماموں کی طرح نیک اور ہمدرد۔“ اس کے لہجوں سے بے اختیار نکلتا ہی حاجرہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور اسے بیٹھے دیکھ کر اندر آ گئی۔

”اب کسی طبیعت ہے زارا؟“ حاجرہ نے اس کی بیٹھانی پر ہاتھ رکھا۔

”بخار تو اب کم ہی لگتا ہے۔ سوائے دودھ کے صبح سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ میں بختی لے آئی ہوں۔ ڈبل روٹی کے ساتھ تھوڑی سی لے لو۔ تین بجتے والے ہیں۔ دوا کی دوسری خوراک کا وقت بھی ہو گیا ہے۔“

زارا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن حاجرہ کا غلوس اور محبت وہ انکار نہ کر سکی۔

حاجرہ بختی اور ڈبل روٹی لے آئی، اس نے بمشکل ایک سلاسل لیا۔ حاجرہ نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ جانتی تھیں صرف بخار نے ہی بھوک نہیں اڑائی، ماضی کا تکلیف دہ سفر بھی دل پر بوجھ کی طرح دھرا ہے۔

”آپا.....“ اس نے بختی کا خالی باؤل ایک طرف میز پر رکھ کر حاجرہ کی طرف دیکھا۔ مرے ہوئے پرتو ایک دن صبر آ جاتا ہے آپا، لیکن جواز نہ ہی جدا ہو جائے اس پر صبر کیسے آئے۔ آپ باج وقت نماز پڑھتی ہیں۔ اتنی نیک ہیں میرے لیے دعا کیا کریں نا مجھے صبر آ جائے۔ میں دھمی کو بھول جاؤں وہ مجھے بالکل یاد نہ آئے۔“

”تم بھی نماز پڑھا کر روزا۔ اللہ اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ ان کی فریاد ضرور سنتا ہے۔ تم بھی اللہ سے اپنے بیٹے کے لیے دعا مانگا کرو، فریاد کیا کرو کہ وہ تمہیں مل جائے۔“ حاجرہ دوسری

اس نے انہیں تسلی دی تو وہ خاموش ہو گئے۔ کچھ گئے تھے زارا نے بلا وجہ یہ فیصلہ نہیں کیا ہوگا۔ صابرہ کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ اس لیے خود جا کر پہلے مولوی صاحب سے بات کی جن سے پرانی واقفیت تھی کہ کہیں کوئی ٹکڑ کرانے پر مل جائے جہاں وہ اپنی بہن اور بھانجی کو بے فکر ہو کر چھوڑ جائیں۔ آس پاس اچھے اور شریف لوگ رہتے ہوں۔ ان کے مختصر حالات بھی مولوی صاحب کو بتائے تو انہیں فوراً حاجرہ کا خیال آیا۔ ایک بار حاجرہ نے ان کی بیوی سے کہا تھا کہ کوئی بیوہ عورت ہو تو اوپر کا پورشن خالی پڑا ہے سوچ رہی ہوں۔ رکھ لوں دوسرا ہٹ ہو جائے گی۔

”نہیں خیر مالی پریشانی تو ان لوگوں کو نہیں ہے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ آپ ان خاتون سے کرائے پر گھر لینے کی بات کریں۔“

شمس اتنی بھی مولوی صاحب سے تحصیل جان کر مطمئن ہو گئے۔

شروع شروع میں تو یہاں آ کر بھی زارا خوف زدہ اور پریشان رہی۔ دو تین دن تو شمس اتنی ان کے ساتھ ہی رہے تھے۔ خود اسکول چھوڑ کر آئے۔ جو نزدیک ہی تھا۔ اور پھر ان کے جانے کے بعد کئی دن تک وہ ادھر ادھر خوف زدہ ہو کر دھمکتی کہیں اکبر نہ ہو آس پاس۔ چادر سے چہرہ اچھی طرح چھپائے وہ گھر سے نکلتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا خوف کم ہوتا گیا۔ اسٹاف اچھا تھا۔ دو تین ہم عمر لڑکیوں سے دوستی ہو گئی تھی فری پڑنے میں گپ شپ لگتی تھی۔ دل کسی حد تک بھل گیا تھا۔ لیکن گھر آ کر تنہائی ملتے ہی جیسے سارے دکھ جاگ اٹھتے تھے۔

ناصرہ کی حاجرہ اور مولوی صاحب کی بیوی کے علاوہ بھی کچھ خواتین سے آتے جاتے سلام دعا ہو جاتی تھی لیکن زارا حاجرہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆  
”کیا زندگی میں اب وہ کبھی اپنے بیٹے کو نہ

”وہ سب کی سنتا ہے زارا! نیک گناہ گار سب کی بس دل سے اسے نکالو۔ وہ ضرور سنے گا۔“  
 حاجرہ کے لہجے میں یقین تھا لیکن زارا بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔  
 ”آپ کو نہیں پتا نجیب کے بعد ہم نے کتنی مشکلات دیکھیں ہمیں راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ ابا ساری رات محن میں چکر لگا کر نجیب کو پکارتے۔ اللہ سے فریاد کرتے۔“

وہ ہوئے ہوئے نجیب کے مرنے کے بعد جو جوان پر گزری تھی بتاتی چلی گئی شمس الحق کے انہیں یہاں چھوڑنے تک سب بتا دیا۔  
 ”تمہارا بیٹا ان شاء اللہ تمہیں ضرور واپس لے گا۔ اتنا چھوٹا بچہ عدالت یوں بھی ماں کے ہی حوالے کرتی ہے پھر انہی صورت میں جب باپ عیاش اور شرابی ہو۔ میں حاجی صاحب سے بات کروں گی ان کا ایک بھانجا وکیل ہے۔ پھر ہمارے محلے کی بندگی میں خیا صاحب رہتے ہیں ویسے تو وہ فوجداری مقدمے لیتے ہیں لیکن ہماری راہنمائی کر سکتے ہیں۔ ہم بیچ کی کھدی کے لیے کیس کر دیں گے۔“  
 حاجرہ نے اسے تسلی دی لیکن زارا خوف زدہ ہو گئی۔

نہیں آپا..... نہیں اسے پھر پتا چل جائے گا کہ ہم لوگ یہاں ہیں پھر وہ اپنے غمزدہ دوستوں کو لے کر یہاں آجائے گا اور ہنگامہ کرے گا۔ مجھ پر جھوٹے الزام لگائے گا۔ آپ کا سکون بھی برباد ہو جائے گا۔ نہیں مجھے کیس نہیں کرنا آیا۔ بس آپ میرے لیے دعا کیا کریں کہ مجھے نجیب کی موت اور واپسی کی جدائی پر صبر آجائے۔ میں نے مایوس کے گاؤں جانے کے بعد انہیں بھی منع کر دیا تھا کیس کرنے سے کہ پتا چلا تھا کہ اکبر کی دادی نے مرنے سے پہلے اپنا گھر اور زمین سب اکبر کے نام کرنے کے بجائے واصف کے نام کر دی تھی اور اس کے بعد وہ کسی صورت اسے ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔ حالانکہ ماموں نے کسی کے ذریعے اسے کہلوا یا تھا کہ

چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔  
 ”اے مجھے ملنا ہوتا تو وہ میرے پاس سے جاتا ہی کیوں آیا۔ اللہ چاہتا تو اب اسے دل میں اسے اکبر کو دینے کا خیال ہی نہ پیدا ہوتا۔ اور اگر ابانے اسے دے ہی دیا تھا تو پھر اللہ نجیب کو ہم سے نہ لیتا۔ وہ ہوتا تو وہ اسے جیسے بھی ہوتا لے آتا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ واپسی کو لے کر آئے گا۔“  
 اس کی کوئی دوست نہیں تھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کے سامنے وہ نجیب کے بعد دل کی بات کرتی آج حاجرہ نے پوچھا تو اس نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ دکھ جو اس نے اٹھائے وہ تکلف نہیں جو پرداشت کیں حتیٰ کہ اپنی سوچیں تک حاجرہ کو بتا دی تھیں۔

”ایسے نہیں کہتے زارا۔“  
 حاجرہ کی آنکھوں میں ایک نرم سی کیفیت تھی اسے اس لڑکی پر ترس آ رہا تھا جو بہت بارے بیٹھی تھی۔ امید کی کوئی لو اس کے دل کو روشن نہیں کرتی تھی اور جس کا اس دنیا میں اپنی ماں کے سوا کوئی نہ تھا۔  
 ”نجیب اپنی ہی عمر لے کر آیا تھا سو اسے جانا ہی تھا۔ تم اس کی معفرت کی دعا کیا کرو اللہ اس کے آگے کے راستے آسان کرے اور اپنے لیے بھی دعا کیا کرو۔ اللہ ضرور سنے گا، جلد یادیر۔“  
 ”کیا اللہ نے آپ کی سنی تھی حاجرہ آپا۔ جب جمال بھائی آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“  
 تاہم نے اسے جمال الدین کے حلق بتایا تھا۔

”میں نے خود کو اللہ کی رضا پر راضی کر لیا تھا زارا!“ حاجرہ کے سانولے رخساروں پر سرخی سی پھیل گئی تھی تاہم لہجہ ایسے ہی نرم تھا۔  
 ”آپ تو اتنی نیک ہیں اماں کہتی ہیں سب آپ کی تعریف کرتے ہیں..... اللہ نے آپ کی نہیں سنی تو مجھ جیسی لڑکی کی وہ کیوں سنے گا۔ میں نے تو کبھی نماز بھی باقاعدگی سے نہیں پڑھی۔“ اس نے جیسے حاجرہ کی بات ہی نہیں سنی تھی۔

دروازوں کا رنگ بھی بدل دیا جائے۔ لیکن عصی کی بات کا بھی کسی نے جواب نہیں دیا تھا بس ایک بار باقر نے کہا تھا اتنے لوگوں کا روزگار چل رہا ہے یہاں سے مشکل کر کہاں جائیں گے بے چارے۔ نئے سرے سے دوسرے علاقے میں سیٹ ہونا اور نئے سرے سے کاروبار چمکانا آسان نہیں ہوتا۔

”میں نے پوچھا ہے طاہر ہم نے پھر کیا سوچا ہے۔“ خدیجہ نے اپنی بات دہرائی تو طاہر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کس کے متعلق؟“

”شادی کے متعلق۔ اماں ابا چاہتے ہیں کہ چھوٹی کی شادی کے ساتھ تمہاری بھی شادی ہو جائے۔“

طاہر کو آئے دو دن ہو گئے تھے اور خدیجہ کو آج موقع ملا تھا اس سے بات کرنے کا۔ اماں حاجی صاحب کے گھر گئی ہوئی تھیں زیب خالہ کی حراج پر ہی گئے لیے، کہ چند دن پہلے ان کے بچے کا آپریشن ہوا تھا ہسپتال میں تو وہ خالہ بیرون اور حاجہ کے ساتھ ہو آئی تھیں۔ لیکن اب انہیں گھر آئے ہوئے بھی چار دن ہو گئے تھے وہ جابھی نہ سکی تھیں۔۔۔۔۔ جاتے جاتے وہ اسے تاکید کر گئی تھیں کہ طاہر سے پوچھ لے کہ آخر کیا مسئلہ ہے۔ دو تین سال سے مسلسل ٹال رہا ہے۔ تمہارے ساتھ بے تکلفی ہے اس کی، پوچھ لینا کہ اگر کہیں کوئی پسند کر چکا ہے تو بتا دے اچھا ہے ہمیں بھی دس گھروں میں نہیں جانا پڑے گا۔

”لیکن خود میرا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے شادی کا۔“ اس نے جانے کا گھونٹ بھرا۔

”کیوں کیا بوڑھے ہو کر شادی کرو گے؟“ وہ ہولے سے ہنسی لیکن آنکھوں میں سوچ کی گہری لکیر تھی۔ ”تمہارے تقریباً سب دوستوں کی شادی ہوئی ہے بس ایک تم ہی رہ گئے ہو۔ اگر کسی کو پسند کرتے ہو تو بتا دو اماں ابا کو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”جانتا ہوں لیکن میں فی الحال شادی نہیں کرنا

وہ کچھ لے کر واصل کو مجھے لکھ کر دے دے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ وہ بہت چالاک اور ہوشیار ہے اور بہت ہی گھٹیا ہے، اگر ہم نے کیس کر دیا تا تو پھر اس نے ہمیں جین نہیں لینے دیتا، اور مٹی والوں نے ننگ آ کر ہمیں یہاں سے نکال دیتا ہے۔“

”ہمازی مٹی والے ایسے نہیں ہیں زارا۔ پھر بھی تم پریشان نہ ہو تمہاری مرضی کے بغیر تو کچھ نہیں ہوگا۔“ حاجہ مکڑی ہو گئی تھی۔

”مجھے کچھ دوپے رنگ کر کل دیئے ہیں۔ حمید دھوبی کی بیٹی کی شادی اچانک طے پا گئی ہے تو وہ کچھ دوپے دے گئی تھی رکھنے کے لیے۔ کل دوں گی انہیں تو پھر کوئی گونا کناری اور کام واپس کر دانا ہوگا۔ اس موضوع پر پھر بات کریں گے کہ تمہارے بیٹے کو کیسے لیا جائے۔“

حاجہ اسے آرام کرنے کی تلقین کر کے باہر آ گئی لیکن کام کرتے ہوئے بھی مسلسل سوچتی رہی کہ زارا کے بیٹے کو کیسے اس کے باپ کے چہل سے چڑایا جائے۔ کیس کے بغیر یہ ناممکن تھا اور۔۔۔۔۔ اچانک اسے ایک خیال آیا اور وہ دل بدل میں میجر طاہر سے بات کرنے کا فیصلہ کر کے مطمئن سی ہو گئی۔

☆☆☆

”تو تم نے کیا سوچا ہے طاہر۔“

بزر دروازے والے گھر کے فرسٹ فلور کے صحن میں خدیجہ تخت پر بیٹھی تھی اور اس کے پاس ہی طاہر بیٹھا تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں چائے کے کپ تھے اور سامنے بڑی لکڑی کی میز پر ایک پلیٹ میں کچھ بسکٹ رکھے تھے۔ باقر رنگ ساز کے گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں پر آج بھی بزر رنگ تھا اور ٹیرس کے چنگے کو بونگن دہلیا کی بیلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ کراؤن فلور پر دکائیں تھیں۔ عصی جب بھی سینکے آتی، مشورہ دیتی تھی کہ دکائیں ختم کر کے کراؤن فلور پر ایک خوب صورت ڈرائنگ روم اور گیٹ روم مع اچھڑ ہاتھ کے بنادیا جائے۔ اور نہیں تو ان کھڑکیوں

چاہتا تم اماں کو سمجھاؤ۔“ وہ خدیجہ کو بے حد سنجیدہ لگا۔  
 ”پتا ہے طاہر، میرا ارادہ سارہ کی شادی پر ہی  
 آنے کا تھا لیکن اماں نے کہا کہ ایک چکر پہلے لگا جاؤ  
 تاکہ تمہارے لیے کوئی لڑکی فاضل کر کے مفتی کر دیں  
 اور پھر شادی چند ماہ بعد سارہ کی شادی کے ساتھ ہی  
 ہو جائے۔ اور اب میرے واپس جانے میں بھی  
 زیادہ دن نہیں رہے اور ابھی تک تم کوئی حتمی بات نہیں  
 کر رہے ہو کہ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے۔“ وہ  
 جانے کا خالی کپ میز پر رکھ کر اس کی طرف دیکھنے  
 لگی۔

”بس نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ جھنجھلایا۔

”اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی طاہر، اور اب  
 کی بھی صحت کوئی اتنی اچھی نہیں ہے وہ اپنی زندگی  
 میں تمہاری خوشی دیکھنا چاہتے ہیں۔“

اس نے خدیجہ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا بس  
 سر جھکاؤں گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پیتا رہا۔  
 ”وہ کون ہے طاہر؟“ چند لمحوں کے بعد  
 دیکھنے کے بعد خدیجہ نے پورے یقین سے پوچھا۔

”وہ کیا پتا تا کہ وہ کون ہے جو دل میں دھرتا رہا  
 کہ بیٹھی ہے کون یقین کرے گا کہ بس ایک مختصر سی  
 ملاقات اس کے دل کی دنیا میں ہلچل مچا گئی تھی۔ وہ  
 ایک نظر اسے گھاس کر گئی تھی۔ شریک مسکراہٹ لیں  
 پر بجائے سبھی سبھی پھنسا رہی آنکھوں والی اس لڑکی پر  
 پڑنے والی پہلی نظر ہی اسے اسیر کر گئی تھی۔ وہ آج  
 تک اس سحر سے باہر نہیں نکل سکا تھا اور اس نے اسی  
 لمحے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا  
 تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ پھر بھی وہ اسے دیکھ ہی نہیں  
 پائے گا۔ وہ جو سوچ رہا تھا کہ گھر جا کر اماں سے بات  
 کر کے وہ اس کے بھائی سے بات کرے گا۔ اسے  
 ہارڈ اپریا میں بھیج دیا گیا اور جب وہ واپس آیا تو اسے  
 پتا چلا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ کون تھا  
 کہاں رہتا تھا وہ کچھ بھی تو نہ جانتا تھا اور اگر وہ اس  
 کے یونٹ سے اس کا پتا وغیرہ لے بھی لیتا تو منہ  
 اٹھائے کیسے رشتہ مانگنے چلا جاتا۔

کئی دن کی سوچ بچار کے بعد وہ اس کے  
 یونٹ کے ایک ساتھی سے اس کا پتا وغیرہ لے کر وہاں  
 پہنچ گیا، اس نے سوچا تھا کہ ابھی وہ اس کے والدین  
 سے تعزیت کرے گا۔ لیکن وہاں سے پتا چلا تھا کہ  
 بیٹے کی وفات کے بعد وہ لوگ یہاں سے چلے گئے  
 ہیں۔ کہاں اس کا علم کی کو نہ تھا۔ اور وہ واپس ہونے  
 کے باوجود اپنے دل کو کسی اور کے لیے راضی نہ کر پاتا  
 تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے اپنی زندگی میں کسی  
 اور کو شامل کر لیا تو وہ اس کے ساتھ انصاف نہیں  
 کر پائے گا۔ وہ اسے وہ محبت نہیں دے پائے گا جس  
 کی وہ حق دار ہوگی۔

خدیجہ بخود اسے دیکھ رہی تھی، اس کے سوال  
 پر اس کی آنکھوں میں جو رنگ اچانک چمک کر مدہم  
 ہوئے تھے انہوں نے اس کے یقین پر ہر لگا دی تھی۔  
 ”ہمیں اس کا اتنا پتا تا کہ طاہر، تا کہ ہم کو کوشش  
 کریں۔ لیکن اگر وہ لا حاصل ہے تو میرے بھائی کوئی  
 فیصلہ کر لو۔ اماں اپنی خوشی کے لیے۔ یوں شادی  
 سے انکار کر کے انہیں دہی مت کرو۔ لا حاصل  
 منزلوں کا سفر تھا دیتا ہے۔ جب آپ کو پتا ہو کہ  
 طویل مسافت کے بعد بھی آپ کے لیے آگے کوئی  
 خطر نہیں کمزور پھر جتنے کا کیا فائدہ طاہر۔“

خدیجہ کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں اور  
 میجر طاہر کو لگا جیسے اس کی یہ دوستوں جیسی بہن اس  
 کے دل تک جھانک آئی ہے۔ اور اس نے وہ جان لیا  
 ہے جو اس نے کبھی خود سے بھی کھل کر نہیں کہا تھا۔  
 تب وہ سب کچھ بتاتا چلا گیا اپنے دل پر گزرنے والی  
 وہ واردات جو بس چند لمحوں کا کھیل تھی اور اس کا دل  
 صرف اس کا نہیں رہا تھا اس میں کوئی اور بھی کہیں  
 ہو گیا تھا۔

”خالد جگہ پر تو کسی کو بھی بسایا جاسکتا ہے لیکن  
 خدا! جہاں پہلے ہی کوئی موجود ہو وہاں کیسے کسی اور کو  
 زبردستی جگہ دی جاسکتی ہے۔؟“  
 اس نے بات ختم کر کے بے بسی سے خدیجہ کی  
 طرف دیکھا۔

وہاں ہی بالکوئی میں کھڑی ہے اور نظروں کا وہ تصادم  
آج بھی آنکھوں کی چمکی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ نسل  
گروں کی اس گلی کے لوگوں کے خیر میں شاید کہیں  
عشق کے جراثیم بھی شامل ہیں۔ چاہے وہ عشق حقیقی  
ہو چاہے مجازی۔

اس نے سوچا اور لیوں پر مدہم سی مسکراہٹ  
نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

”خدیجہ.....!“

ظاہر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ خدیجہ نے  
جو تک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک آنکھوں میں راز  
رکھنے کی التجا بھی اور دوسرے ہی نظروں میں راز  
رکھنے کا وعدہ۔ ظاہر نے مطمئن سا ہو کر کہا۔

”مجھے کرٹل ایوب نے ایک کام کہا تھا اور مجھے  
اس کام کے سلسلے میں جانا ہے۔ کچھ دیر تک نگلوں گا۔  
شاید دیر ہو جائے تو تم لوگ کھانے پر میرا انتظار نہ  
کرنا۔“

وہ شاید اب اس موضوع پر حرید بات نہیں کرتا  
چاہتا تھا اور خدیجہ نے حرید کچھ پوچھنے کا ارادہ ملتوی  
کر دیا تب ہی سڑکیوں پر حاصرہ نمودار ہوئی۔

”ارے حائرہ آیا آپ!“

دنیوں ہی بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے کہ اس  
گلی کا ہر شخص اس کی ایسے ہی عزت کرتا تھا۔ سب  
گھروں میں اس کا احترام کیا جاتا تھا۔ وہ بہت کم ہی  
گھر سے نکلتی تھی۔ سوائے کئی خوشی کے کسی کے ہاں نہ  
جانی اور کسی کو بھی گدہ بھی نہیں ہوا تھا۔ سو خدیجہ اور  
ظاہر دونوں ہی اس کی آمد پر بے حد خوش ہوئے  
تھے۔

”بیٹھے آپ!“

ظاہر تخت کے پاس سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا  
تھا۔ حائرہ تخت پر بیٹھ گئی تو خدیجہ بھی بیٹھ کر محبت سے  
اسے دیکھنے لگی۔

”سب خیریت ہے نا آپ؟“

”ہاں خدیجہ، اللہ کا شکر ہے۔ تمہاری اماں نظر  
نہیں آ رہی ہیں اور بچے بھی۔“ حائرہ نے ادھر ادھر نگاہ

”اس کا خیال میرے دل سے نکلتا ہی نہیں  
ہے میں جب زندگی کے سادگی کا تصور کرتا ہوں تو وہ  
چم سے میرے خیالوں میں آ جاتی ہے۔ پھر بھی  
مجھے چند دن اور دے دو میں ایک کوشش اور کرنا چاہتا  
ہوں، یہاں سے جا کر میں ایک بار پھر اس کے شہر  
میں جاؤں گا۔ اگرنا کام رہا تو تمہیں اور اماں کو اختیار  
ہے۔ میرے متعلق جو بھی فیصلہ کریں۔“

اس کی آنکھوں میں ایک پرسوزی کیفیت تھی  
اور خدیجہ اس کیفیت سے انجان تو نہیں تھی۔ اسے  
یکدم شہزادہ عالمگیر یاد آیا تو اس نے بے اختیار دعا  
کی۔

خدا کرے تمہیں تمہارا مطلوب مل جائے  
ظاہر۔ ورنہ یہ لا حاصل کی تلاش ساری زندگی دل میں  
کھک بین کر رہتی ہے۔ یہ کھک آدی کو بھی پورے  
طور پر خوش نہیں ہونے دیتی۔ وہ بھی پوری کسی ہنس  
نہیں سکتا..... آدی خوشی، آدی ہنس چاہے سانسے  
خوشیوں کے ڈھیر لگے ہوں اور ہنسنے کے لیے  
ہزاروں باتیں ہوں۔ وہ دعا کر رہی تھی سچے دل سے  
پورے غلوں سے یا تو وہ اسے مل جائے یا اس کا خیال  
ہمیشہ کے لیے ظاہر کے دل سے نکل جائے۔ اور وہ  
پوری ہنسے۔ پوری خوشی محسوس کرے۔

”کیا وہ بہت خوب صورت تھی ظاہر؟“ دل  
سے اٹتی کھک کو دباتے ہوئے اس نے پوچھا۔  
”ہاں نہیں خدیجہ، مجھے تو بس اس ایک نظر نے  
ہی باغداد لیا تھا جو پہلی بار اس کی طرف اٹھی تھی۔ اور  
آج تک اس کشش کے دائرے سے باہر ہی نہیں  
آ پایا کہ سوچتا وہ کیسی تھی..... خوب صورت تھی۔“

اس نے اک گہری سانس لی۔

”بس مجھے تو اس کی وہ گہری سیاہ بھنورا سی  
آنکھیں اور اس کی لائنجی پلکوں کا بار بار اٹھنا اور  
گرنے کا یاد رہ گیا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

کیا وہ میں جانتی تھی ایک نظر کافوں کیسے عمر بھر  
کے لیے اس پر کر لیتا ہے۔ اسے آج بھی لگتا تھا کہ وہ

دوڑائی۔

”اماں تو نذیب خالہ کی طرف گئی ہیں اور بچے ساری دوپہر ادم چاکر اب سوئے ہیں۔ آپ طاہر سے باتیں کریں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔“ خدیجہ اٹھنے لگی تو حاجرہ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

”میں ابھی ابھی چائے پی کر آئی ہوں اور تمہیں پتا ہے میں بہت کم چائے پیتی ہوں۔ اور اس وقت مجھے طاہر سے کام تھا۔“

”جی آپا فرمائیے۔“ طاہر پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوا۔

حاجرہ نے مختصر آساری بات بتادی، خواہ مخواہ تمہید میں وقت ضائع نہیں کیا۔

”قانون بھی اتنا چھوٹا بچہ ماں کے سپرد ہی کرنے کا فیصلہ کرے گا جبکہ بچے کا باپ کا کردار بھی ایسا ہو تو فکر کی کوئی بات نہیں آپا، میرے دوست کا بھائی بہت احماد سل ہے۔“

”ہاں لیکن وہ کیس نہیں کرنا چاہتی طاہر، وہ ڈرتی ہے کہ وہ میاں محلے میں آ کر ہنگامہ کرے گا۔ تمہارے تو کافی لوگوں سے تعلقات ہیں یوں ہی اگر بات چیت سے یا کچھ دے دلا کر مسئلہ حل ہو جائے تو اسے جاندا کا بھی لالچ نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اکبری دادی نے جو جاندا اونچے کے نام کی ہے وہ بے شک لے لے لیکن بچہ اسے دے۔“

حاجرہ نے طاہر کی بات سنتے ہی وضاحت کی۔

”ٹھیک ہے آپا۔“ طاہر نے کلائی الٹ کر وقت دیکھا۔ ”مجھے ایک آفیشل کام سے جانا ہے۔“

کل کسی وقت میں آپ کی طرف آؤں گا اور اس شخص کے متعلق ساری معلومات ان خاتون سے لے لوں گا۔ پھر دیکھتا ہوں کہ کیسے اور کس طرح بچہ حاصل کرنا ہے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”بھول نہ جانا طاہر۔“ حاجرہ نے تاکید کی۔

☆☆☆

حاجرہ نے زندگی میں پہلی بار کوئی کام کہا تھا تو

یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ بھول جاتا۔ سو وہ دوسرے دن اپنے کام سے فارغ ہو کر ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ حاجرہ صبح میں کڑا ہی چولیسے پر رکے کام میں مصروف تھی اور نامہ رخت پر بیٹھی تھیں۔ حاجرہ طاہر کو دیکھ کر خوش ہوئی۔

”آؤ بیٹھو طاہر۔ ابھی میں نامہ رخت آپا سے تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی۔“ اس نے برآمدے میں پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کڑا ہی چولیسے سے اتار کر برآمدے میں آگئی۔

”آپا! یہ بیچر طاہر ہے۔“ میں نے اس سے ساری بات کی تھی۔ ان شاء اللہ یہ بچے کو حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی لے گا۔“ طاہر نے حاجرہ کی طرف دیکھا جو بڑے یقین سے کہہ رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے وہ پریشان ہوا اگر نہ ڈھونڈ سکا تو لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پرسکون ہو گیا۔

”ان شاء اللہ آپا۔“

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اسے حاجرہ کی آنکھوں پر چہرے سے ایک روشنی سی پھوٹی محسوس ہوئی تھی۔ اور اس وقت بھی اسے ایک روشنی کا ہالہ سا ان کے چہرے کے گرد محسوس ہوا تھا۔ چادر سے اچھی طرح اپنے سر اور وجود کو لپیٹے حاجرہ کو دیکھ کر ایک پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔ اور اسے نہ جانے کب کا پڑھا ہوا ایک جملہ یاد آ گیا جانے کس نے لکھا تھا کہ ”عشق حقیقی کی راہ پر چلنے والے صوفیوں نے ہی صرف سلوک کی منزلیں طے نہیں کیں بعض اوقات عشق مجازی کے مسافر بھی سلوک کی منزلیں طے کر لیتے ہیں۔“

اور شاید حاجرہ آپا نے بھی عشق مجازی کی راہ پر چلنے ہوئے ہی منزلیں طے کر لی تھیں۔ حاجرہ نے اگر کہا تھا کہ وہ کوئی راستہ ڈھونڈ لے گا تو وہ یقیناً ایسا کر لے گا۔

”جیتے رہو بیٹا۔“ نامہ رخت عدا دے رہی تھیں۔ اس نے چونک کر انہیں سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔



زارا..... زارا یہ ایک نام تو لہو میں گردش کرتا تھا اس نے بمشکل نظریں اس کے چہرے سے ہٹائیں اور نامہ کہ طرف دیکھا۔  
 ”آپ..... آپ نجیب کی والدہ ہیں..... اور میں میجر طاہر ہوں شاید آپ کو یاد ہو ایسٹ آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔“  
 نامہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں ہارڈ ایریے جب نجیب کا حادثہ ہوا وہاں آیا تو ہاتھ چلا..... میں آپ کی طرف گیا تھا لیکن پتا چلا کہ آپ لپک وہاں سے چلے گئے ہیں۔“  
 وہ دل ٹھٹھکی سے کہتا ہوا بیٹھ گیا تھا۔  
 ”مجھے نجیب کا بہت دکھ ہے خالد جان۔“  
 اب وہ تعزیت کر رہا تھا۔ نامہ رو رہی تھی۔  
 زارا بھی ہولے ہولے چلتی ہوئی وہاں ہی نامہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”یہ اچھا ہوا طاہر، انہیں پہلے سے جانتا ہے۔“  
 حاجرہ نے سوچا اور کچن کی طرف چلی گئی۔  
 نجیب کی موت کا تم تازہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے نجیب کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ فی الحال زارا کے بچے کا مسئلہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ جب کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھا تو اگرچہ نجیب کی والدہ اور زارا کے دکھ سے دل بھاری تھا لیکن وہ احساس جو اسے مضطرب رکھتا تھا اس وقت نہیں تھا رگ دپے میں ایک سکون سا اثر محسوس ہو رہا تھا کہ بلا خراس کی تلاش ختم ہوئی تھی۔ وہ جسے اس نے دن رات سوچا اور خوابوں میں دیکھا تھا جس سے ملنے کی دعائیں کی تھیں وہ مل گئی تھی، وہ خوش تھا، اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اب شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہے۔ اور شاید اب بھی اس کے لیے لاکھائیں

ہے، اس کی دسترس سے دور۔  
 ”اس کی تلاش ختم ہو گئی ہے، وہ مل گئی ہے۔“  
 اس نے خدیجہ کو آ کر بتایا تو خدیجہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی پھر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”تو کیا اب بھی تم اس سے شادی کرنا

”میری بچی بہت تڑپتی ہے اپنے بچے کے لیے۔“  
 ”حاجرہ آبانے مجھے سب بتایا ہے۔ آپ مجھے بچے کے باپ کے متعلق ذرا تفصیل سے بتائیں کہ کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے۔“

اس نے نظریں اٹھائیں نامہ اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں شیشائی سی تھی۔ طاہر بھی چونکا اسے بھی وہ خاتون جانی بچائی سی لگ رہی تھیں جیسے پہلے بھی نہیں دیکھا ہو لیکن کہاں اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ جوان بیٹے کی موت بیٹی کی بربادی، شوہر کے متعلق انکشافات سب نے نامہ کو کافی کمزور کر دیا تھا۔ وہ ان چند سالوں میں جیسے بوڑھی ہو گئی تھیں، رنگت جھلک گئی تھی۔ لیکن نامہ اسے بچان کی تھیں۔ تصور میں ایسٹ آباد کی وہ شام زعمہ ہو گئی تھی۔ نجیب تعارف کروا رہا تھا۔ ”ماں یہ کپٹن طاہر ہیں۔“

تب ہی دروازہ کھلا اور زارا اندر داخل ہوئی۔  
 وہ اسکول سے آئی تھی۔

”السلام علیکم ماں۔ السلام علیکم آیا۔“  
 اور پھر وہ کچن میں ہی ٹھک کر رک گئی برآمدے میں کرسی پر بیٹھا شخص بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک چہرہ جو اس کے تصور میں آ رہا تھا اس کے سامنے تھا۔ سیاہ چادر کے ہالے میں لپٹا وہ دلربا چہرہ، ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے تھے اور وہ کندھے پر لٹکے شوٹرز بیک کے اسٹریپ کو مضطرب سی مروڑ رہی تھی۔ تو کیا وہ کوئی لمحہ قبولیت تھا جب خدیجہ نے دعا کی تھی یا تو وہ اسے مل جائے یا اس کا خیال اس کے دل سے نکل جائے اور وہ برسوں کی تلاش کے بعد اسے مل گئی تھی۔

”یہ نامہ آیا کی بیٹی ہے زارا۔ اسی کے بچے کے متعلق میں نے تم سے بات کی تھی۔“ حاجرہ جو اس کی توضیح کے لیے فروٹ لینے کچن میں جا رہی تھی رک کر تعارف کروانے لگی اور زارا یہ میجر طاہر ہیں، خدیجہ کے بھائی۔“

نظر کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ نہ انتظار تھا نہ

چاہو گے۔“

امید۔

محبت کی گہرائی اور مرضی وہ کہاں سمجھ سکتا ہے

جس نے اس امرت کا ذائقہ نہ چکھا ہو۔

میجر طاہر کے لیوں پر مدہمی میسرکراہٹ نمودار

ہوئی۔ اور وہ خدیجہ کو دہاں ہی برآمدے میں تخت پر

بیٹھا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا کہ اسے حاجرہ

سے کیا وعدہ ہی نہیں ناپا تھا ابھی محبوب ہستی کے غم

زدہ دل کو سکون بھی مہیا کرنا تھا۔ سو وہ کچھ دیر بعد ہی

اپنا بیگ اٹھائے باہر نکلا تو خدیجہ نے حیرانی سے اسے

دیکھا۔

”کیا تم جارہے ہو طاہر۔ ابھی تو تمہاری

چٹیاں ہیں۔“

”ہاں اسی لیے تو جارہا ہوں کہ چٹٹیوں میں

حاجرہ آ جانے جو کام کیا ہے کر سکوں۔ ورنہ ڈیوٹی پر

چلا گیا تو مشکل ہو جائے گی۔ دعا کرنا کہ ایک ماں

کے ذمہ خورہ وہ دل کے لیے مرہم تلاش کر سکوں۔“

وہ اماں سے مل کر باہر آیا تو حیران ہنسی خدیجہ

کے سر پر ہلکے سے چپٹ لگائی۔

”تم پریشان نہ ہو تمہاری فلاح سے ایک دن

پہلے آ جاؤں گا۔“

”اور اماں سے کیا کہوں اب۔“

”کہہ دینا کہ سارہ کی شادی کر دیں مجھے ابھی

نہیں کرنی۔“ وہ بیک کندھے پر لٹکائے میز جیوں کی

طرف بڑھ گیا۔

اور خدیجہ سوچتی ہی رہ گئی کہ اس سنجیدہ اور کم گو

سے طاہر نے جس نے بھی کوئی رومانی ناول تک نہیں

پڑھا تھا اور جو بھی محبت کو خرافات کہتا تھا۔ کیسے محبت کو

اپنے دل کا سکین بنالیا تھا۔

اور وہ اکبر خان کے گاؤں سے اس کا ٹھکانا

معلوم کر کے جب اپنے بے حد مہربان کرٹل ایوب کو

ساتھ لے کر اس کے ٹھکانے پر پہنچا تو حیران رہ گیا

۔ کثرت شراب نوشی نے اس کی حالت مردوں جیسی

کر دی تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہا

”ہاں اب کیا ہو گیا ہے خدیجہ۔ کیا میرے

دل میں موجود اس کی محبت ختم ہو گئی ہے۔ نہیں اب

تو یہ محبت اور شدت سے ابھری ہے کہ وہ دھکی ہے۔

اسے میری ضرورت ہے۔ پہلے سے کہیں زیادہ میں

اس کے ساتھ کا خواہش مند ہوں۔ یہ جوائے سالوں

سے مجھے ایک انتظار سا تھا، ایک آس کی گھٹی کہ وہ

ایک روز مجھے ضرور ملے گی تو شاید یہ اس لیے بھی کہ

اسے مجھ سے ملنا تھا اور یہی حیثیت از دی ہے ورنہ

میں مایوس ہو کر ماں کی بات مان لیتا۔ لیکن میں مایوس

نہیں ہوا کہ اسے مجھ سے ملنا تھا۔“

طاہر کو خدیجہ کی بات پر حیرت ہوئی تھی۔ لیکن

بھلا خدیجہ کو کیا پتا کہ محبت جب کسی دل میں سما جاتی

ہے تو وہ ختم نہیں ہوتی اور جو ختم ہو جاتی ہے وہ محبت

نہیں ہوتی۔

”فی الحال ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں

گے خدیجہ۔ پہلے مجھے زارا کا مسئلہ حل کرنا ہے تم اماں

کو بتا دینا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی وہ سارہ کی

شادی کی تاریخ طے کر دیں۔

”وہ تو ٹھیک ہے طاہر۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے

وہ اب اپنے بیٹے کے ہوتے ہوئے شادی نہ کرنا

چاہے۔ انکار کر دے تو پھر خواہ تو خواہ تم وقت ضائع

کر لو گے۔ بہتر نہیں ہے کہ تم ابھی ہی اس سے بات

کر لو اور۔۔۔۔۔۔“

”نہیں۔ ابھی بات کرنے کے لیے وقت

مناسب نہیں ہے۔“ طاہر نے اس کی بات کاٹی۔

اور میرا وقت ضائع نہیں ہوگا۔ خود مطلوب کے انتظار

میں طالب جو وقت گزارتا ہے اس وقت کا ہر ہر لمحہ

بامقصد ہوتا ہے بیکار نہیں ہوتا۔ لیکن تم شاید نہ سمجھ

سکو۔“

ہاں شاید وہ واقعی کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے

کہاں کسی سے محبت کی گھی۔ ایسی محبت جیسی کوشلیانے

یوسف سے کی۔ حاجرہ نے جمال الدین سے کی اور

عالمگیر نے۔ بس وہ تو ایک نظر کی مجرم تھی اور اس ایک

حوالے کرنے کے بعد وہ ایک بار ہی ادھر گیا تھا کہ حاجرہ نے بتایا تھا کہ وہ اب بھی خوف زدہ ہے کہ کہیں وہ آکر زبردستی چھین نہ لے۔ تو وہ انہیں سمجھانے گیا تھا۔

”اول تو اسے یہاں کا پتا ہی نہیں ہے اور وہ وہ خود مرنے کے قریب ہے۔ اصل میں تو اس نے شکر ادا کیا ہے کہ بچے کی ذمہ داری سے جان چھوٹی ہے۔“

انہیں تسلی دے کر وہ گھر آیا تو دیکھ بچے بے قراری سے اس کی منتظر تھی کہ ایک دن بعد اس کی فلائٹ تھی۔

”تم نے بات کی طاہرہ“  
”پاگل ہو خدیجہ، یہ کوئی موقع ہے بات کرنے کا کیا سمجھیں گی وہ کہ میں نے اس کا بچہ حاصل کر کے دیا ہے تو اب بدلے میں اس کا رشتہ مانگ رہا ہوں۔“

”اچھا لیکن سارہ کی شادی سے پہلے ضرور بات کر لیتا۔“

وہ مایوس ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آج طاہرہ بات کر لے گا اور ادھر سے انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ایک طلاق یافتہ لڑکے لیے طاہرہ جیسا رشتہ کہاں مل سکتا تھا۔“

زیادہ دیر نہ کرنا طاہرہ۔“ اس نے جاتے جاتے ایئر پورٹ پر بھی تاکید کی تھی۔ ”ابا، اماں، اب تمہاری خوشی بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔“

لیکن انسان کے اختیار میں تو کچھ نہیں ہوتا۔ سارے فیصلے تو اوپر ہوتے ہیں سوتا خیر تو ہوئی چلی گئی۔

☆☆☆

سارہ کی شادی کے کئی مہینوں بعد اس نے حاجرہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔

”میں زارا سے شادی کرنا چاہتا ہوں آپا۔ اور یہ نہ بھڑدی ہے نہ ترس بلکہ میں نے اس کے ساتھ جی تمنا اس وقت کی تھی جب پہلی بار ملا تھا۔“

تھا۔ کرنل ایوب نے اس کے ساتھ بٹے کیا تھا پہلے افہام و تفہیم سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کریں گے پھر قانونی کارروائی کی بات کریں گے۔ پہلے تو اس نے کچھ کڑو دکھائی لیکن پھر سیدھا ہو گیا۔

”تمہاری دادی نے بچے کے نام جو کچھ کیا ہے۔ زارا اور اس کی والدہ کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ تم رکھو اور بچہ اس کی ماں کے حوالے کر دو۔“

کرنل ایوب بہت بابرعب شخصیت کے مالک تھے۔ تھوڑی سی لیت و صل کے بعد وہ راضی ہو گیا کہ شاید اب بچے کو سنبھالنا اس کے لیے بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اور اسے رقم کی بھی ضرورت تھی۔ بچے کی حالت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بہت کمزور سا تھا۔ وہ ان کے ساتھ گاؤں آیا تھا اس کی دادی کے منجھپوں نے زمین خود خرید کر رقم ادا کر دی تھی جو اکبر خان کو دے دی گئی تھی۔ مگر تو پہلے بھی اس کے قبضے میں ہی تھا۔

”اصل میں تو یہ سب کچھ میرا ہی ہے۔ دادی نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔“

اس نے رقم لیے ہوئے کہا تو کرنل ایوب جو کچھ رقم اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ بھی اسے دے دی اور گاؤں کے کچھ معزز لوگوں کے سامنے اس نے لکھ کر دے دیا تھا کہ اس کا اب بچے سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔

یہ کام میجر طاہرہ کو جتنا مشکل لگ رہا تھا اتنی ہی آسانی سے ہو گیا تھا۔ دراصل اس میں اب رقم ختم باقی نہیں رہا تھا۔

”اچھا ہے بچہ اپنی ماں کے پاس چلا جائے گا ورنہ اس کی جو حالت ہے یہ اب زیادہ دن جی نہیں پائے گا۔“

”یہ گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا جس کا اظہار انہوں نے طاہرہ اور کرنل ایوب کے سامنے کیا تھا۔“

☆☆☆

اور ابھی اس کی چھٹیاں باقی تھیں کہ وہ واپس آ گیا تھا۔ ناصرہ اور زارا اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تھیں۔ اور وہ شرمندہ ہو جاتا۔ واصف کو ان کے

طاہر۔  
”آخری سانس تک۔“ وہ اس سے کھل کر  
بات کر سکتا تھا۔

”لا حاصل انتظار کا کیا فائدہ طاہر۔“  
”محبت فائدہ اور نقصان نہیں دیتی خدیجہ۔“

”اس نے سوتیلے رشتے کا جو زیر بچا ہے وہ  
اسے تم پر اعتبار نہیں کرنے دیتا۔ وہ ڈرتی ہے کہ نہیں  
اس کا بیٹا بھی اس رشتے کی وجہ سے اس تکلیف سے  
نہ گزرے جس سے وہ گزری تھی۔“

حاجرہ نے اسے زارا کا خوف اور ڈرتایا تھا۔  
”تم اس سے خود بات کرو طاہر، شاید اس کا اعتبار  
بحال ہو سکے۔“

”اچھا میں حاجرہ آپا سے بات کروں گا پتا  
نہیں وہ اس طرح مجھ سے بات کرنا چاہے گی بھی یا  
نہیں۔ پھر مجھے اپنی محبت سے زیادہ اس کی عزت  
عزیز ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اس کے کردار پر  
انگیٹھا ہے۔“

اسے خدیجہ کی بات پسند تو آئی تھی لیکن پھر بھی  
پہلے اس نے حاجرہ سے بات کی تھی کہ ایک بار پھر وہ  
اس سے بات کریں اور یہ کہ اگر وہ اجازت دے تو وہ  
اس سے خود بات کرنا چاہتا ہے۔

”میں کوشش کروں گی طاہر، کہ وہ تم سے بات  
کر لے شاید تم اسے قائل کر سکو۔ لیکن اگر نہ کر سکو تو  
اپنے اماں ابا کی خوشی کے لیے ان کی بات مان لیتا۔“  
حاجرہ جانتی تھی کہ جب دل مجبور ہو جائے تو  
پھر مقصود و مطلوب ملے گی ہی ہوتی ہے پھر بھی اس نے  
سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”میں اماں ابا کی بات نہ ماننے کا قصور وار  
ہوں آپا۔ لیکن کیا کروں میرے سارے راستے تو  
اسی کی طرف جاتے ہیں اور وہاں ہی جا کر ختم  
ہو جاتے ہیں۔ اور جب راستے ہی ختم ہو جائیں تو  
بندہ کہاں جائے۔“ اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا  
تھا۔

حاجرہ کے لبوں سے بے اختیار اس کے لیے

”یہ تو بہت اچھی بات ہے طاہر۔ اور تمہاری  
اعلیٰ طرفی ہے، میں نامصرہ آپا سے بات کروں گی۔“  
”یہ اعلیٰ طرفی نہیں ہے آپا۔ میری دلی آرزو  
ہے۔ میں چاہتا ہوں اماں سے بات کرنے سے پہلے  
ان کی رائے جان لوں۔“

حاجرہ کو بھی خدیجہ کی طرح خیال تھا کہ نامصرہ  
انکار نہیں کرے گی۔ لیکن زارا نے انکار کر دیا۔

”میجر طاہر نے میرے لیے سوچا میں ان کی  
ممنون ہوں لیکن مجھے شادی نہیں کرنی۔“

”لیکن زارا، اس طرح چھوٹے بچے کے  
ساتھ اکیلی زندگی کیسے گزارو گی۔ عورت کو مرد کے  
سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”میرا بیٹا ہے نا آپا۔۔۔۔۔۔ اب میری زندگی اس  
کے لیے ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا بیٹا بھی اسی  
تکلیف سے گزرے جس سے میں گزری ہوں۔ میں  
نے سوتیلے باپ کی نفرت بھی ہے۔“  
”طاہر ایسا نہیں ہے زارا۔ وہ میرے سامنے

کھیل کود کر رہا ہوا ہے۔ کم عمری سے ہی اس کی سوچ  
اور خیالات بہت اچھے تھے۔“ حاجرہ نے اسے قائل  
کرنے کی کوشش کی تھی۔

”جانتی ہوں آپا۔ لیکن پھر بھی مجھے شادی نہیں  
کرنی آپا۔“ اس کا فیصلہ حتی تھا۔

”تمہیک ہے آپا۔ وہ اپنے حلق فیصلہ کرنے کا  
حق رکھتی ہے۔ میں انتظار کروں گا اس وقت کا جب  
اس کا دل میرے ساتھ زندگی گزارنے کو آمادہ  
ہوگا۔“

اور یہ انتظار دو سال اور تین ماہ محیط ہو گیا تھا  
خدیجہ ان دوسالوں میں دوبارہ آئی تھی اور چاروں  
بہنوں نے طاہر سے اصرار کیا تھا کہ وہ شادی  
کر لے۔

”کر لوں گا لیکن ابھی نہیں۔“ وہ انہیں ٹالتا  
صرف خدیجہ بھی جو جانتی تھی کہ وہ کیوں انکار کرتا  
ہے۔

”کب تک اس کی رضا مندی کا انتظار کرو گے

بے آواز دعا نکلتی تھی۔

یا اللہ! اسے باہر ادرنا۔ ضروری تو نہیں کہ اس گلی کے سارے ہی لوگ نامراد ٹھہریں کوئی تو ہو جو نامراد ٹھہرے۔ اور اس نے اسی روز زارا سے بات کی تھی۔

”میں ٹرانسفر کی کوشش کر رہی ہوں آپا۔“ اس نے نظریں چرائیں۔

یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے زارا۔“ حاجرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں سامنے نہیں ہوں گی تو میجر طاہر کے دل سے میرا خیال نکل جائے گا اور وہ.....“ گلے میں جیسے آنسوؤں کا گولا سا پھنسا تھا۔

”اور جب تم سامنے نہیں تھیں تو تمہارا خیال اس کے دل سے گیا تھا کیا؟ تب اس نے مایوس ہو کر کسی اور کے لیے رضامندی دی تھی کیا؟“

حاجرہ کو خدیجی نے سب بتا دیا تھا کہ شاید وہ وہی زارا اور طاہر کو سمجھا سکے۔

”نہیں تا میری جان پسندیدگی جب محبت میں اور محبت عشق میں ڈھل جائے تو پھر راستے بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ طاہر کے لیے بھی اب راستہ بدلنا ممکن نہیں رہا۔ تم اپنے دل میں تھوڑی سی وسعت پیدا کر لو۔ خود کو ماضی کے خلاف سے آزاد کر لو زارا۔ طاہر تمہارا بہت اچھا مسافر ثابت ہوگا۔ عورت کے لیے تمہارا جتنا آسان نہیں ہوتا۔ خالہ کب تک تمہارا ساتھ دیں گی۔ تم یہاں سے ٹرانسفر کروانے کی اجازت شہر میں جانا چاہتی ہو تو تمہارے پاس کیا ضمانت ہے کہ وہاں سب لوگ اچھے ہوں گے۔ تم جوان ہو خوب صورت ہو، اور بہت سارے اچھے لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جو تمہارے لیے زندگی مشکل کر دے۔“

”میں تو اس لیے یہاں سے جانا چاہتی ہوں کہ مجھے آپ مجرم سا لگنے لگا ہے۔ جیسے میں خدیجہ آپا اور ان کے والدین کو خوشیوں میں رکاوٹ ہوں۔ ورنہ اماں اور میں کب یہاں سے جانا چاہتے ہیں اور

اب تو دوا سی بھی ہر وقت آپا آپا کرتا رہتا ہے۔ رات کو سوتے میں بھی چل اٹھتا ہے کہ آپا کے پاس جانا ہے۔“ زارا کے اپنے ڈر اور خوف تھے۔

”تم یہاں رہ بھی جاؤ تو خالہ اور میں ہمیشہ تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ ایک روز سب کو جانا ہی ہے تو.....“

حاجرہ کی نظریں انھیں تو بے اختیار اس کے لیوں سے نکلا۔

”تو اس گلی کے لوگ تو ہیں نا جنہیں آپ نایاب کہتی ہیں۔ کیا یہ مجھے تحفظ نہ دیں گے۔“

”یہ لوگ جو آج ہیں شاید کل نہ ہوں۔ آنے والی طلیس کیسی ہوں گی کون جانے۔ زندگی میں جتنی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، جس تیزی سے اقدار بدل رہی ہیں یہاں اس گلی کے رہنے والے کتنے بدل جائیں گے کیا خیال۔“ حاجرہ کھڑی ہو گئی تھی۔

”تم نے اگر فیصلہ کر بھی لیا ہے زارا، تو ایک بار اس کی بات سن لو۔ شاید وہ تمہارا اعتبار بحال کر سکے۔“

اور وہ اس کی بات ہی تو نہیں سنتا چاہتی تھی وہ ڈرتی تھی ان سیاہ خوب صورت آنکھوں کے طلسم سے جو اینٹ آباد کی اس شام اس کی طرف اٹھی تھیں۔ اسے لگا تھا کہ وہ بھی ان کی کشش کے دائرے سے باہر نہیں آ سکے گی۔ کیا جادو تھا کیا طلسم تھا ان آنکھوں میں کہ جب بھی نظریں ملتیں وہ اس کی طرف کھینچتی تھیں۔ اور یہ کھینچ اس کے دل کو زنجیر کرتی تھیں۔ ان کے طلسم سے تو وہ تب بھی نہیں نکل سکی تھی جب اپنی دانست میں وہ اس بحر کو توڑ کر اکبر خان کے کٹار میں آئی تھی تب بھی کبھی کبھی جب وہ بستر پر لیٹی تھی تو ان ساحر آنکھوں سے نکلتی روشنیاں اس پر کھنکھرتی ڈالتیں ایسے جکڑتی تھیں۔ اور وہ انہیں جھٹک جھٹک کر تھک جاتی تھی۔

تب اس نے راشد منیر کا احسان چکانے کے لیے اس طلسم کا جال توڑنے کی کوشش کی تھی اور اب واصف کی خاطر وہ ان سے چھٹی پھر رہی تھی..... وہ تو

کہ شام ہو جائے فیصلہ کر لینا اور یاد رکھنا کہ کوئی زندگی کے آخری سانس تک تمہارا خطرہ رہے گا۔ مجبوری سے نہیں، دل و دماغ کی پوری رضا مندی کے ساتھ فیصلہ کرنا۔“

وہ اس کے جھکے ہوئے سر پر ایک نظر ڈالتا ہوا لمبے لمبے ڈبک بھرتا باہر نکل گیا۔ حاجرہ بچن سے نکل کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ نہ اس نے کچھ پوچھا نہ زار نے اس سے کچھ بتایا۔ بس اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں کو نم کرتے رہے۔ اور حاجرہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”بعض اوقات فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے زار۔ لیکن مشکل فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں جو آگے چل کر زندگی کو آسان بنا دیتے ہیں۔

☆☆☆

لیکن اگر اس رات ناصرو پیار نہ ہو جاتیں تو شاید وہ یہ مشکل فیصلہ بھی نہ کر پائی۔ ناصرو کو بھی یہی دے کی تکلیف ہو جاتی تھی اس رات بھی ان کا سانس اکڑ گیا تھا۔ ان ہلکے کے استہلال سے بھی سانس ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ بار بار اکڑنے لگا۔ اس نے گھبرا کر حاجرہ کو آواز دی تھی۔ ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی گلی میں چہل پہل بھی۔ کچھ نماز عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے۔ مہنگا ابھی ایک دکان پر بیٹھا تھا۔ عید وغیرہ اور کسی شادی بیاہ کے موقع پر وقت پر کپڑے دینے کے لیے دکان دیر تک کھلی رہتی تھی۔ سو آج بھی شاید اسے کسی کی شادی کے کپڑے تیار کرنے تھے۔ کارنگر دھڑا دھڑشیں چلا رہے تھے اور ہادی گھوڑا اور کئی دوسرے لڑکے اس کی دکان کے سامنے لکڑی کی سیڑیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی مہنگا بھی ان کی باتوں میں شریک ہو جاتا تھا۔ حاجرہ نے ذرا سادہ واہ کھول کر دیکھا۔ سامنے طالب اپنا کھوکھا بند کر چکا تھا ایک ہاتھ میں چپک (چائے دان) اور دوسرے ہاتھ میں پیالیاں تھیں۔ پیالیوں کے کناروں میں انگلیاں ڈالیں وہ کچھ ٹنگتا تا ہوا مڑا تو حاجرہ نے اسے آواز

خدیجہ کی آنکھوں کی طرف بھی نہیں دیکھتی تھی کہ وہ آنکھیں بالکل خدیجہ کی آنکھوں جیسی تھیں، چمکتی ہوئی گھور سیاہ آنکھیں۔ پھر بھی اس شام وہ نگاہیں جھکائے میجر طاہر کے سامنے سخت پریشانی تھی۔

میجر طاہر مضطرب سا بھی ایک پاؤں پر زور دیتا اور کبھی دوسرے پاؤں پر زور دیتا کھڑا ہوا اس کی طرف دیکھتا تھا۔

حاجرہ یوں ہی کینٹ سے برتن نکال کر واپس رکھ رہی تھی۔ طاہر کے آنے کے بعد ایک بار اس نے سوچا تھا کہ وہ اوپر ناصرو کی طرف چلی جائے لیکن پھر مناسب نہیں لگا تھا کہ وہ انہیں تنہا چھوڑ کر جائے کہ اگر کوئی اچانک آجائے تو خواہ مخواہ دونوں کو تنہا دیکھ کر اٹکی اٹھائے۔

باہر دوسرے جھکائے بیٹھی تھی، کبھی لمبے گزر گئے دل کی دنیا میں پھل پھل رہی تھی۔ ایپٹ آباد کی وہ شام دل کی دھڑکوں کو بے ترتیب کرتی تھی جب بس یوں ہی اس نے سوچا تھا کہ عجیب کا یہ دوست، یہ ساحر آنکھوں والا ہی وہ شہزادہ ہو جو اسے کھوجتا ہوا اس شام کو اچانک مل گیا تھا اگرچہ اس کے پاس شیشے کی کوئی گرگانی نہ تھی۔

”زارا! میں جانتا ہوں اس شام صرف میرا دل ہی اسیر نہیں ہوا تھا۔ تمہاری آنکھوں کے آئینوں میں میرا عکس بھی ٹھہر گیا تھا۔ محبت کسی الہام کی طرح ہم دونوں کے دلوں پر ایک ساتھ وارد ہوئی تھی۔ اور جہاں محبت ہو وہاں بے اعتباری نہیں ہوتی زار۔ پھر تم واصلہ کے معاملے میں مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتیں۔ تم کیوں ڈرتی ہو کہ میں واصلہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کروں گا۔ واصلہ تمہارے حوالے سے مجھے اتنا ہی پیارا ہے جتنا تمہیں ہے لیکن میرے پاس تمہیں اس کا یقین دلانے کے کچھ نہیں۔ صرف لفظ جو کھوکھلے بھی ہوتے ہیں اور غصوں بھی۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک بار تم سے مل کر تمہیں یقین دلاؤں گا اپنے اخلاص اور محبت کا لیکن اب سب بے معنی لگ رہا ہے ہاں تمہارا دل گواہی دے تو پھر اس سے پہلے

دی۔

”جی آپا!“

وہ چونک اور پیالیاں وہاں ہی تھڑے پر رکھ کر اس کے پاس آیا تو حاجرہ نے اسے نامرہ کا بتا کر ڈاکٹر ہاشمی کو بلائے کہہا۔ وہ نامرہ کی حالت دیکھ کر خود بھی گھبرا گئی تھی۔

”آپ فکر نہ کریں ابھی لے کر آتا ہوں ڈاکٹر صاحب کو۔“

اور پھر ڈاکٹر ہاشمی کے آنے سے پہلے ہی بروین خالہ، آپاجی، بطوم اور خدیجہ کی والدہ حاجرہ کے کمر میں موجود تھیں۔ بروین خالہ اسے تسلی دے رہی تھیں۔ آپاجی نامرہ کی بیٹھ کو ہولے ہولے سہلا رہی تھیں جبکہ خدیجہ کی اماں منہ ہی منہ کچھ بڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ ٹھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر ہاشمی آگئے تھے اور وہ کمر پر ہی انہیں ٹریسٹ دے رہے تھے۔

باہر ہادی کی دکان کے تھڑے پر گھوم، طابلی، ہادی اور حمید بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر ہاشمی نے کچھ دوائیاں اور انجکشن لکھ کر دیا تو ہادی اپنی سائیکل پر جا کر مین روڈ پر موجود میڈیکل اسٹور سے جو رات بھر کھلا رہتا تھا دوائیاں لے آیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی نامرہ کا سانس بحال ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے انہیں انجکشن لگایا اور اپنا بیگ اٹھا کر کمرے ہو گئے۔

ان شاء اللہ اب سکون سے سوتی رہیں گی۔ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ آنسو جنہیں وہ مشکل روکے ہوئے تھے، بہہ نکلے تھے۔

نیچے گلو، ہادی سب ہی حاجرہ سے کہہ رہے تھے۔

”آپا! اگر پھر طبیعت خراب ہوگئی تو فوراً ہمیں بلا لیجیے گا خدا نا خواستہ اگر ہسپتال لے جانا پڑا تو حاجی صاحب کی گاڑی میں لے جائیں گے۔“ ان کے متعلق حاجرہ تو جانتی تھی کہ اسی گلی کی

ہاں تھی لیکن اوپر اس کے آنسو جھریں بہتے تھے۔

”اگر آپ کہیں تو میں ادھر بیٹھک میں زمین پر بستر بچھا کر لیٹ جاتا ہوں کہ اگر رات کو ضرورت پڑ جائے تو آپ کو گلی میں باہر نہ نکلتا پڑے کسی کو بلانے کے لیے۔“

”گلو بادشاہ تو ایسا ہی تھا۔“

”نہیں اسی کی ضرورت نہیں ہے بھلا۔“

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بیڑھیوں اتر کر دروازے کے پاس حاجرہ کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ ”ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ اب اماں سکون سے سوتی رہیں گی۔ میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں۔“

”تو بھلا اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے بھلا بہنوں نے بھی کبھی بھائیوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ دیکھو ذرا گلو نے ہادی کی طرف دیکھا۔

اور اس کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے تھے اور آ کر بھی تھی ہی دیر تک اس اعلا میں اور محبت پر آنکھیں بھیک بھیک جاتی تھیں۔ یہ سچ میں ہی نایاب لوگ تھے۔ اس نے حاجرہ کو زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا تھا اور خود واضح کو جو جاگ گیا تھا دوبارہ سلا کر نامرہ کی چارپائی کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور پھر نہ جانے کب کرسی کے ہتھے پر سر رکھ کر کھسکی ہوئی تھی۔

فجر سے ذرا پہلے نامرہ کی آنکھ کھلی تو مطلق خشک ہو رہا تھا۔ انہوں نے زارا کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے آواز دی تو زارا راہ پر آ کر اٹھ بیٹھی۔

”آپ ٹھیک ہیں اماں۔“ وہ گھبرا گئی تھی۔

”ہاں پانی دے دو، اور تم یہاں کرسی پر کیوں سوری ہو، میں اب ٹھیک ہوں۔“ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے نامرہ نے کہا تو انہیں پانی دیتے ہوئے وہ در پڑی۔

آپ کی طبیعت اتنی خراب ہوگئی تھی میں ڈر گئی تھی کہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔ میرا آپ کے سوا اس دنیا میں ہے ہی کون۔ میں کیسے جیتی اماں آپ کے بغیر۔“



خالی گلاس اسے واپس کر کے کتنی ہی دیر تک وہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہیں پھر ایک گہری سانس لی۔

اسی لیے تو چاہتی ہوں کہ اپنی زندگی میں ہی تمہیں محفوظ ہاتھوں میں سونپ دوں۔ میں نے ہمیشہ نہیں رہنا زارا۔ جب ملاو آ یا جانا ہی ہوگا۔ آج سانس بحال ہو گئیں، ہو سکتا ہے کل ریکس تو واپس ہی نہ آئیں اور زندگی ختم۔“

”اماں.....“ اس نے تڑپ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا آئسو زیادہ روانی سے بچنے لگے۔

”ظاہر اچھا لڑکا ہے زارا۔“ ناصر نے اس کا ہاتھ چھتیا یا۔

”مجھے ڈر لگتا ہے اماں کہ کہیں میرا بیٹا بھی اس ہی اذیت سے نہ گزرے جس سے میں گزری تھی۔“ ابابا کی وہ نفرت بھری نظریں آج بھی اس کے وجوہ میں جھپکتی تھیں۔

ہر شخص راشد خیر نہیں ہوتا زارہ میری جان۔ آج لوگ پوچھ رہے ہیں۔ ننب آپا نے بھی ایک دو رشتے بتائے ہیں..... کل جب زندگی کی شام وصل جائے گی تو کوئی شخص نہیں ہوگا۔ ظاہر نہ سبھی کوئی اور سبھی۔ ننب آپا کے بتائے ہوئے رشتے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ جہاں تمہارا دل مانے لیکن اکیلی عورت سب کے لیے تر توالہ ہوتی ہے۔ یاد ہے نا جب ہم گاؤں میں بھائی کے ساتھ نہیں جانا چاہتے تھے تو انہوں نے کیا کہا تھا اکیلی عورت کی مثال بے چھت اور بغیر کواٹھ کے مکان کی طرح ہوتی ہے کہ جس کا جی چاہے اندر گھس آئے اور تمہارا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے زارہ۔“

اتنی ہی بات کرنے سے ان کا سانس پھولنے لگا تھا وہ لیٹ گئیں اور اسے بھی بستر پر جا کر آرام سے سونے کی تلقین کی۔ ابھی فجر میں وقت تھا وہ واصف کے پاس جا کر لیٹ گئی اور ناصرہ کی باتیں اس کے کانوں میں گھونٹنے لگیں۔

کوئی اور کیوں ظاہر ہی کیوں نہیں۔ اس نے

سوچا تھا۔ اماں کہتی ہیں کہ جہاں میرا دل مانے اماں کو کیا پتا میرا دل تو آج تک ایٹ آباد کی اس شام اپنی طرف اٹھنے والی نظروں کو بھلائی نہ سکا۔ لیکن..... اس نے واصف کی طرف کروٹ بدلی۔ اس کی کشادہ پیشانی پر پھرے اس کے رنجی بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کیا۔ لیکن وامی کے لیے اس کی خاطر۔ بس چند سال پھر میرا بیٹا بڑا ہو جائے گا میں تو چٹا نہیں رہوں گی۔ اور میجر ظاہر..... دل کر لایا تو آنکھوں کے کونے سے آنسو نکل کر ٹپکے بھگوئے لگے۔

اور پھر بس ذرا سی دیر کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک کلمے میدان میں کھڑی ہے۔ آس پاس ادھر ادھر کوئی نہیں ہے دور جنگل سے کئی بھیر یوں کی خوف ناک آوازیں آتی ہیں۔ پھر یکا یک بادل گر جے لگے۔ بجلیاں چمکنے لگیں اور مولا دھار بارش ہونے لگی۔ وہ خوف زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی ہے کہ اچانک نہ جانے کہاں سے بھیر یوں کا ایک غول نمودار ہوتا ہے۔ اپنی زبانیں باہر نکالے خوف ناک انداز میں خونی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ اوپر آسمان کی طرف دیکھتی ہے کہ ایک کڑک دار آواز کے ساتھ بجلی چمکتی ہے ادھر بھیر بے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ خوف سے اس کی جھنجھکی۔

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی اس کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے ٹھہرا کر اوپر اور پھر چاروں طرف دیکھا۔ یہ تو ان کا کمر تھا۔ اوہ تو کیا یہ خواب تھا۔ اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ مسجد میں فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ ناصرہ اور واصف سو رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا اور پھر نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے اس نے وہ مشکل فیصلہ کر لیا جو آگے چل کر اس کی زندگی میں آسانیاں اور خوشیاں لانے والا تھا۔

”اماں! حاجرہ آپا کو میجر ظاہر کے لیے ہاں کہہ دیجیے گا۔“

لڑکیاں مر گئی ہیں۔“ کئی دن تک اس کا منہ پھولا رہا۔  
خدیجہ نے سمجھا یا۔  
”نہیں۔ لیکن اگر زارا ہاں نہ کرتی تو تیرا اکلوتا  
بھائی ساری عمر شادی نہ کرتا۔“

خدیجہ کو اطلاع کر دی گئی تھی اور وہ پہلی  
دستیاب فلاٹ سے آگئی تھی کہ طاہر نے شادی  
جلدی کرنے کا کہا تھا کہ اسے تین ہفتوں بعد کسی  
کورس کے لیے جانا تھا۔ سودوں گھروں میں شادی  
کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ طاہر تو اکلوتا بیٹا تھا اور  
نہیں دھوم دھماکے سے شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن  
نامرہ بھی دل کے ارمان کاٹنا چاہتی تھیں کہ پہلی بار  
راشد منیر نے کچھ کرنے نہیں دیا تھا سوزا را کے بار بار  
منع کرنے کے باوجود دھڑا دھڑ خریداری کی جارہی  
تھی۔ مدد کے لیے نوبت آپا کلٹوم پروین سب ہی  
موجود تھے۔ باہر کے کام بھی گلی کے مردوں نے  
سنبھال لیے تھے کسی نے ٹریک والوں سے بات  
کرنے کی ذمہ داری لے لی تھی تو کسی نے ٹینٹ  
والوں سے بات کر لی۔

ہادی گھو، طالب، حاجی صاحب مولوی  
صاحب سب نے ہی نامرہ کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ  
بالکل فکر نہ کریں سب کام بخیر خوبی ہو جائیں گے  
مہنگا دھڑا دھڑا پڑے ہی رہا تھا کہ بری کے کپڑے  
بھی اسے ہی تیار کرنے تھے اور جینز کے بھی۔ نامرہ  
نے جس شخص کو بھی اطلاع کر دی تھی کہ وہ واحد رشتہ  
دار تھے۔ وہ آئے تھے لیکن یہاں چونکہ سب کام  
ہو رہے تھے اس لیے مطمئن ہو کر شادی سے دو دن  
پہلے سب کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے  
تھے۔ لیکن جانے سے پہلے انہوں نے اکبر خان کی  
موت کا بتایا تو وہ جو ایک خوف ساقا، زارا کے دل  
میں کہ نہیں وہ اس کی شادی کے بعد واصل کو چھین نہ  
لے۔ نکل گیا۔ لیکن پھر بھی وہ گھبرائی اور بولائی سی  
حاجرہ سے پوچھتی۔

”آپا! بہت جلدی نہیں ہے۔ ابھی تو میں  
نے ہاں کی گئی اور شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی۔“

نامرہ کو ناشتا کروانے کے بعد اس نے انہیں  
اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ خوش ہو گئیں۔  
”اب مرتے ہوئے یہ سکون ہوگا کہ میرے  
بعد تم کی کمی نہیں ہوگی۔“

جب انہوں نے حاجرہ کو بتایا تو اس نے فوراً  
ہی سٹار شوژ والوں کے گھر سے طاہر کو فون کر دیا اور  
طاہر تو جیسے اڑتا ہوا آیا تھا۔

اماں طاہر کی بات سن کر لڑھ بھر کے لیے خاموش  
ہو گئی تھیں۔ لیکن جب محمد باقر نے سراہا۔

”مجھی بات ہے بیٹا، کسی بیوہ یا مطلقہ سے  
نکاح کرنا ثواب کا کام ہے اور پھر اس کے بچے کی  
کفالت کرنے کا دگنا اجر لیکن پہلے اچھی طرح سوچ  
لو کہ کل کو جب تمہارے اپنے بچے ہو جائیں تو اس  
کے بچے کے ساتھ انصافی کرو یا اس کی حق سنی ہو تو  
اللہ ناراض ہوگا۔“

”میں نے اچھی طرح سوچ کر یہی فیصلہ کیا  
ہے بابا۔“

طاہر اب انہیں کیا بتاتا کہ زارا اسد تو اس کے  
دل کی اولین خواہش تھی۔

”آپ میرے بچے کو ایسا سمجھتے ہیں میرا طاہر تو  
بڑے دل اور بڑے ظرف والا ہے اور وہ چچی تو بڑی  
بیاری اور سلیقے فرینے والی ہے۔“

طاہر کی اماں نے ناراضی سے محمد باقر کی طرف  
دیکھا۔ ”ور جادو اٹھا کر کھڑی ہو گئیں کہ یہ نسل گروں  
کی گلی کے لوگ تھے بڑے ظرف اور بڑے دل  
والے۔“

”میں جا کر ابھی نامرہ بہن سے بات کرتی  
ہوں۔“

طاہر جانتا تھا کہ اس کے والدین بڑے دل  
والے ہیں۔ اعتراض نہیں کریں گے باقی کسی کو بھی  
اعتراض نہیں تھا۔ سوائے عصمت کے، وہ تھوڑی سی  
سطحی سوچ رکھتی تھی۔

”ہمارا اکلوتا بھائی اور اس کے لیے ایک مطلقہ  
اور ایک بچے کی اماں کیلئے پاکستان کی ساری کنواری

ہمارے طاہر بھائی کی شادی ہے۔ فوجی بینڈ ہوگا اور طاہر بھائی فوجی وردی میں دولہا بنے ہوں گے اور ہم سب لڑکے بارات کے آگے بھگڑا ڈالتے ہوئے آئیں گے، ہیں نا ہادی بھائی۔“

اس نے پاس کھڑے ہادی کے کندھے پر ہاتھ مارا تو ہادی مسکرائی۔

”ہاں میرے یار تم طالبی وغیرہ کے ساتھ آنا بھگڑا ڈالتے ہوئے میں اور مہنگا بھائی تو حاجی صاحب اور مولوی صاحب وغیرہ کے ساتھ بارات کا استقبال کریں گے۔ زارا آپا کا بھائی نہیں ہے نا تو ہم ہیں نا ان کے بھائی۔“

اور اس کا دل گداز ہو کر جیسے کھٹکنے لگا تھا۔ ہادی اور پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا اس نے سنا نہیں وہ قدرے دور ہو گئے تھے اور اب ان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ ذرا حیدر شمس کے جھنگے کے نزدیک آئی اور اس پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھگی۔ طاہر وادف کا ہاتھ پکڑے اس سے جبکہ کہہ رہا تھا۔ وادف ہنسا اور طاہر نے اسے گود میں اٹھا کر اس کا رخسار چوما تھا اور اس کی آنکھوں میں محبت اپنائیت اور چاہت کے سارے رنگ تھے۔ اس کے اندر ایک طمانیت کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ اب بھی خدشوں میں گھر جانے والا دل جیسے ہر خوف سے آزاد ہو گیا تھا۔

وہ سنڈر بلا نہیں تھی، نہ ہی اس کی کوئی سوتیلی ماں اور سوتیلی بہنیں تھیں پھر بھی ایک شہزادہ نہ جانے کتنے سالوں کی مسافت طے کر کے اسے کھوجنا ہوا آ گیا تھا۔

وہ زارا اسد تھی اور زعمی اس پر مہربان ہو گئی تھی۔

ایک خوب صورت مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر ٹھہر گئی۔

☆☆

”جلدی کہاں زارا! طاہر کے اختیار میں ہوتا تو اسی روز رخصت کروا کے لے جاتا۔ لیکن بہنوں کے ارمان انہیں تو سارے فنکشن کرنے ہیں۔“ حاجرہ کے لبوں پر ہنسی خوب صورت سی مسکراہٹ نے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔

”لیکن آپا! اب یہ تیل مہندی مایوں اچھا لگے گا! بس سادگی سے نکاح ہو جاتا لیکن میری تو کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔“

بہنو اس سیاہ آنکھوں میں غم پھیلنا چلا گیا تو حاجرہ نے اس کے احساسات کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔

”زارا میری جان! جب ہم دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی خواہشات کی فنی کرتے ہیں تو اللہ ہم سے راضی ہوتا ہے۔ تو تم بھی سب کی خوشی کے لیے اپنے دل کو راضی کر لو میری جان۔“

اب پتا نہیں دل اس دھوم دھڑکے پر راضی ہوا بھی تھا یا نہیں لیکن وہ خاموش ہو گئی تھی۔ طاہر کے کمر میں بہنوں نے دوھولک رکھ لی تھی۔ رات کو عشاء کے بعد دوھولک بجا کر شادی بیاہ کے مخصوص گیت گائے جاتے جن کی آوازیں بالکونی کے کھلے دروازے سے اس کے کمرے تک آتیں۔ اماں مسکرا کر اسے دیکھتیں اور وہ جھینپ جاتی۔ پروین خالہ کی بیٹیاں اور دوسری لڑکیاں دن میں اس کے گھر آنکھی ہو جاتیں۔ اس کے کپڑے استری کیے جاتے۔ جوڑے ٹانگے جاتے، دوپٹوں کو لیس لگائی جاتی اور اس کا من ان غیر لوگوں کی محبت اور اخلاص پر بھیکتا رہتا۔ کیسے لوگ تھے اسے نہیں تھے لیکن انہوں سے بڑھ کر..... حاجرہ کے جھول نایاب لوگ۔

شادی میں دو دن ہی رہ گئے تھے۔ باہر گلی میں ہلکا شور تھا۔ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے کمرے میں ٹیبلٹس میں آئی تو گلی بھر نور پنی ہوئی تھی گلو سانسے سبز دروازوں والے مکان پر رنگین بٹیاں لکوار ہا تھا۔ نیلی چلی سبز مچیں جل بجھ رہی تھیں۔

”میں تو اپنے گھر پر بھی بٹیاں لگواؤں گا۔ آخر